یکم مارچ ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۵

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

رمضان المبارک کی آمد، بے چراغ غزہ میں چراغاں

منصور جعفر

رمضان المبارک کی آمد ہو چکی۔ رحمتیں سایہ فگن ہیں۔ مگر غزہ میں اسرائیلی جنگ کا چھٹا ماہ جاری ہے اور بدترین جنگ کے ۱۶۰ دن گزر چکے ہیں۔ پورا غزہ مسلسل اسرائیلی بمباری نے ملبے کا ڈھیر بنا رکھا ہے۔ بس اکا دکا گھر بچے ہیں۔ وہ بھی بے چراغ۔ ہر طرف تباہی کی خاک، در و بام کی راکھ اور بارودی دھوئیں کا راج ہے۔

اب تک ۳۱,۲۷۲ فلسطینی جان سے جا چکے ہیں جن میں دو تہائی تعداد میں فلسطینی خواتین اور بچے شامل ہیں۔

اسرائیل کو مغربی دنیا میں ہونے والے مظاہروں کی پروا ہے نہ ۵۷ رکنی او آئی سی نام کی تنظیم کا خوف۔ وہ پوری طرح دولت و ثروت اور قوت و سلطنت کے حاملین سے بے نیازی دکھا رہا ہے۔ اسی سبب رمضان المبارک کے دوران بھی اسرائیل نے غزہ میں جنگ بندی کرنے سے انکار اور رفح پر جنگی یلغار کا ایک بار پھر اعلان کر دیا۔ صرف یہی نہیں غزہ کے ۲۳ لاکھ سے زائد فلسطینیوں کے لیے رمضان المبارک میں بھی خوراک اور ادویہ تک کی فراہمی میں حائل بے رحمانہ رکاوٹوں کو ہٹانے تک کا عندیہ نہیں دیا۔

یورپی یونین کے خارجہ امور کے سربراہ جوزف بوریل نے تو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں منگل کے روز اس حد تک کہہ کر عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی کہ 'غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف بھوک کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے'، مگر تا حال سلامتی کونسل کے ضمیر کی نیند پوری طرح سلامت ہے۔

تاہم یہ بات خوش آئند ہے کہ اس بار رمضان المبارک میں یوم القدس کے موقع پر غزہ کی یادبطور خاص منائے جانے کی تیاریاں عوامی سطح پر شروع ہو چکی ہیں جبکہ فلسطین فاؤنڈیشن پاکستان نے پورے رمضان کو 'ماہ فلسطین' کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ 'سیو غزہ' نامی تنظیم سمیت کئی دوسرے گروپ اسے 'رمضان الاقصیٰ' کے نام سے یاد رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ غزہ میں اسرائیل اشیائے خور و نوش کی ترسیل رمضان المبارک میں بھی روکے رکھے گا بلکہ فلسطینیوں کو سحر و افطار اور صلوٰۃ و تراویح کے دوران کسی بھی وقت بمباری کا خطرہ رہے گا۔ اسی طرح اسرائیلی میزائل اور ڈرون حملوں کے ساتھ ساتھ ٹینکوں سے گولہ باری اور سنائپرز کا استعمال بھی جاری رہے گا۔ واضح طور پر اسرائیل کا اعلان ہے 'کر لو جو کرنا ہے، میں اسرائیل ہوں! جو چاہوں گا کروں گا'۔

اس بہیمانہ طرزِ ریاست نے پورے خطے ہی نہیں عرب و عجم میں پھیلے دنیائے اسلام کو ایک سانپ کی طرح سونگھ کر چھوڑ دیا ہے۔

بات غزہ میں ملبے کے ڈھیر اور بچے کھچے چند بے چراغ گھروں کی ہو رہی تھی۔ یہ درمیان میں 'راکھ کے پرانے چلے آ رہے ڈھیر' کا ذکر آ گیا۔ واپس اسی بے چراغ اور تاراج غزہ کی گلیوں کی طرف چلتے ہیں جہاں موت و حیات کی کشمکش جاری ہے، مگر اہل غزہ نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ہر قیمت اور ہر صورت زندہ رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ چھٹے ماہ میں داخل اسرائیلی جنگ ان کے عزم کو کمزور کر سکی ہے نہ امید کو مایوسی میں بدل سکی ہے۔

اس عزم اور امید کا تازہ اظہار رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر دیکھنے میں آیا ہے۔ اگرچہ غزہ اور اس سے جڑے فلسطینی علاقوں، مقبوضہ مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس بشمول مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی جبر کے سائے گہرے اور سنگین پہرے ہیں، اس کے باوجود غزہ میں گھروں کے ملبے پر بھی اہل غزہ نے علامتی طور پر ہی سہی رمضان المبارک کا استقبال کیا ہے۔

روایتی انداز میں غزہ کے فلسطینیوں نے رمضان کی آمد پر اپنے اپنے گھروں کے ملبے کے ڈھیروں پر بھی سجاوٹی جھنڈیاں لگائی ہیں اور چراغاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ یہ جھنڈیاں اور یہ چراغاں وسیع پیمانے پر نہیں مگر یہ ان کی اللہ کی رحمت و نصرت اور برکت سے امید کا غیر معمولی اظہار ضرور ہے۔ ایک ایسا اظہار جس سے صاف لگ رہا ہے کہ جس طرح فلسطینی روایتی طور پر اپنی اگلی نسلوں کو اپنے 'حق وطن واپسی' کی علامت کے طور پر 'کنجیاں' منتقل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اندرونی صفحات پر

- کیا اسرائیل مکمل جنگ کا متحمل ہو سکتا ہے
- مودی جنوبی بھارت کو جیت پائیں گے؟
- مودی کا دورہ سرینگر اور انتخابی بگل
- آخر جنوبی افریقا ہی کیوں!
- سُوئی یوکرین جنگ پر اٹکی ہے!
- روس کے جاسوسوں کی واپسی
- یوکرین جنگ: کتنے روسی فوجی مارے جا چکے؟
- دائیں بازو کا عروج، یورپی سیاست پر اثرات
- یہ ساری خرابیاں کس کھاتے میں؟
- غزہ میں رمضان۔۔۔

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

اس رمضان المبارک کی آمد کے موقعے پر بھی اپنی پرجوش کاحتی المقدور اور روایتی اظہار کر کے انہوں نے اپنی اگلی نسلوں کو رحمتِ خداوندی سے جڑے رہنے کا سبق اور بے رحم دنیا کو پیغام دیا ہے، 'مایوس نہیں، پُرامید اور پرعزم ہیں ہم۔'

غزہ کے فلسطینی بدترین جنگ میں اپنے بہت سے پیاروں کو کھو چکے ہیں۔ چھتوں سے محروم ہو کر بے گھر ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کی بنیادی نوعیت کی اشیا تک سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔ بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ امید اور حوصلے کا دامن چھوڑ دینا ان کا شعار نہیں ہے۔

ان فلسطینیوں کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کے قبلہ اول کے امین اور متولی ہونے کے ناطے وہ مسجد اقصیٰ کے لیے بھی تمام تر مشکلات کے باوجود اپنی جاں سپاری کا بلا کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ آج بھی ارضِ فلسطین کو معراج واسریٰ کی سرزمین کے طور پر عقیدت و محبت سے دیکھتے ہیں، اس لیے اس کے تحفظ اور مسجد اقصیٰ میں عبادت کے لیے اپنی زندگیوں کی ہی نہیں بچوں کی جانیں تک قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے گرد لگے اسرائیلی فوجی پہروں کو بار بار توڑتے ہیں۔ خصوصاً رمضان المبارک میں یہاں جوق در جوق پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ خود آتے ہیں بلکہ اپنے اہل خانہ کو ساتھ لاتے ہیں۔ فلسطینی خواتین اس سلسلے میں مردوں سے کسی بھی طرح پیچھے رہنے والی نہیں ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے غزہ کی چھٹے ماہ میں داخل اسرائیلی جنگ میں ہزاروں کی تعداد میں جانیں پیش کر کے بھی ثابت کیا ہے۔

یہ فلسطینی خواتین 'المرابطات' کی صورت رمضان المبارک میں مسجد اقصیٰ آ کر تلاوت و نوافل کا اہتمام کرتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ افطاری کے اوقات میں حرم اقصیٰ میں موجود نمازیوں کے لیے سامان افطار کا بھی اہتمام کرتی ہیں۔

گویا تمام تر اسرائیلی پابندیوں کے باوجود رمضان المبارک میں بطور خاص مسجد اقصیٰ کا آنگن رحمتوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ فلسطینیوں کے پورے پورے گھرانے رحمت و برکت اور اسرائیلی عذاب سے نجات کی تمناؤں کے ساتھ اپنی جانوں پر کھیل کر یہاں پہنچ کر تلاوت و تراویح اور اعتکاف کا اہتمام کرتے ہیں۔

فلسطینی عوام اپنی اس روایت کو اس رمضان المبارک میں بھی تمام تر اسرائیلی رکاوٹوں اور جنگی قہر سامانیوں کے باوجود جاری رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ مسجد اقصیٰ جسے اسرائیل کھنڈر میں تبدیل کرنے پر تلا ہوا ہے، آباد رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں، اس پر چراغاں کا اہتمام کرتے ہیں۔

شاید نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان پر پوری دنیا کے مسلمانوں کی طرف سے بھی عمل کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں حکم دیا گیا ہے کہ حرم کعبہ، حرم مسجد نبوی اور حرم اقصیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں، اگر نہ آسکیں تو مسجد اقصیٰ کے چراغ جلانے کے لیے تیل بھجوانے کا اہتمام ضرور کریں۔

مسجد اقصیٰ کو روشن اور آباد رکھنے کے لیے تیل بھجوانے کے اہتمام کا حکم آج ''تیل اور تیل کی پیداوار'' سے چلنے والی دنیا میں اور بھی سمجھ میں آتا ہے۔ بہرحال فلسطینی عوام اپنی حد تک اپنی تمام تر کسمپرسی کے عالم میں بھی مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور ارض فلسطین کے لیے جان تک لڑا دیتے ہیں۔

اسرائیل ایک عرصے سے مسجد اقصیٰ میں ۴۰ سال سے کم عمر کے فلسطینیوں کے داخل ہونے پر پابندی لگائے ہوئے ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو اجازت بھی انتہائی محدود تعداد میں دی جاتی ہے۔ جگہ جگہ ناکے، چوکیاں، جامہ تلاشیاں اور پہرے اسرائیلی ریاست کی سالہا سال سے امتیازی شناخت بن چکے ہیں کہ مسلمان مسجد اقصیٰ میں نہ جا سکیں۔ مذہبی آزادیوں کے برعکس یہ پہچان اسرائیل کے لیے کسی عالمی طاقت اور ادارے کے لیے تکلیف دہ یا پریشان کن نہیں ہے۔

رمضان المبارک سے پہلے بھی یہ پابندیاں اور رکاوٹیں پورا سال موجود رہتی ہیں، جبکہ رمضان المبارک میں مزید سخت کر دی جاتی ہیں۔ یہودی بستیوں میں گھرے مغربی کنارے اور بیت المقدس میں اسرائیلی فوج، پولیس اور یہودی آبادکاروں کو مسجد اقصیٰ کی طرف آنے والے مسلمانوں کو روکنے کے لیے کامل اسرائیلی بے رحمی سے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس سال نیتن یاہو کے انتہا پسند اتحادیوں ایتمار بن گویر اور سموٹریچ کی موجودگی میں اس کا خطرہ اور بھی زیادہ ہے کہ مسجد اقصیٰ آنے والوں پر مغربی کنارے اور یروشلم میں جگہ جگہ حملے ہوں گے۔ بن گویر اس سلسلے میں بیان بھی دے چکے ہیں کہ مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ جانے کی اجازت دینے کا رسک نہیں لے سکتے۔

لیکن یہ سوچ غلط ہے کہ اہل فلسطین بھی میری اور آپ کی طرح یعنی دیگر مسلمانوں کی طرح رک جائیں گے، چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے، خوفزدہ ہو جائیں گے یا سمجھوتہ کر لیں گے۔

غزہ میں اتنی وسیع پیمانے پر تباہی اور بڑے پیمانے پر اموات کے بعد بھی اگر وہ رمضان المبارک کی آمد پر اپنے گھروں کے ملبے پر بیٹھ کر جھنڈیاں لگاتے اور چراغاں کرتے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ مسجد اقصیٰ کے لیے اسرائیلی ایجنڈے کی راہ ہموار کرنے میں وہ بھی دوسروں کی طرح سہولت کار اور تعاون کار بننے کے الزام کی کالک اپنے منہ پر ملیں کہ رمضان المبارک تو ان کے ایمان اور یقین کے مطابق رحمت، برکت و نصرت کا مہینہ ہے۔ اس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اس میں تو اللہ کے فرشتوں اور روح الامین کی آمد ہوتی ہے۔ فرشتے نصرت لے لے کر آتے ہیں، اس لیے کوئی تیل بھیجے نہ بھیجے وہ تو اپنے خون سے بھی مسجد اقصیٰ کے چراغوں کو روشن رکھیں گے۔ خواہ ان کے سحر وافطار کے دستر خوان ان کے اڑوس پڑوس اور دور و نزدیک کے آسودہ حال مسلمانوں کے دستر خوانوں کی طرح سونے اور چاندی کی طشتریوں سے محروم رہیں کہ وہ تو اب پرندوں کی خوراک اور جانوروں کے چارے یا درختوں کے پتوں سے گزارہ کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔

جنگ بندی کا نہ ہونا اور نا کہ بندیوں کا ہونا اب ان کے لیے معنی نہیں رکھتا۔ انہیں یقین کی دولت مل چکی ہے کہ اصل روشنی تو خون جگر سے جلائے جانے والے چراغوں سے ہوتی ہے:

ہَوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۶ر مارچ ۲۰۲۴ء)

●●●

بقیہ: روس کے جاسوسوں کی واپسی

نہیں رہا۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ کریملن کو خوف ہے کہ ایسی صورت میں یورپ اور امریکا سے مخاصمت حد سے نہ بڑھ جائے اور معاملات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ روس ہر وقت اور ہر جگہ تو بہت کچھ نہیں کر سکتا۔

روس کے جاسوسوں کے لیے کام بڑھ گیا ہے۔ یوکرین جنگ کے حوالے سے امریکا اور یورپ سے مخاصمت بڑھنے کے باعث انہیں کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے۔ یوکرین کی سپلائی لائن کو متاثر کرنا ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ ایسٹونیا کی فارن انٹیلی جنس سروسز نے جو سالانہ رپورٹ جاری کی ہے، اس میں ان روسیوں کے نام بھی دیے گئے ہیں جو اپنے ملک کے خفیہ اداروں کے لیے کام کرتے پائے گئے ہیں۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Russian spies are back—and more dangerous than ever". ("The Economist". Feb 20, 2024)

●●●

کیا اسرائیل مکمل جنگ کا متحمل ہوسکتا ہے

چند ہفتوں کے اندر اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو پارلیمنٹ سے جنگ کے ہنگامی بجٹ کی منظوری لینے والے ہیں۔ اس بجٹ میں غربِ اردن کے یہودی آبادگاروں کے لیے مزید فنڈ بھی شامل ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی اسکولوں کے لیے بھی مزید فنڈنگ ممکن بنائی جائے گی۔ ان اسکولوں میں بچے جدید ترین فطری علوم وفنون کے بجائے صرف مذہبی تعلیم پائیں گے۔ اس کا بنیادی مقصد مخلوط حکومت میں شامل جماعتوں کے درمیان نظریاتی تقسیم کو کم کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی سے جان بھی چھڑانی ہے۔

اسرائیل میں سوشلسٹ آدرشوں کے مطابق بہبودِ عامہ پر بہت کچھ خرچ کیا جاتا رہا ہے۔ اگر جنگی بجٹ منظور ہوا تو بہبودِ عامہ پر خرچ کی جانے والی رقم میں کمی واقع ہوگی۔ اس کے نتیجے میں فوج کا بجٹ تقریباً دُگنا ہو جائے گا۔ اسرائیل میں ایک غیر تحریری عمرانی معاہدہ سات عشروں سے رُو بہ عمل ہے۔ ایک طرف فلاحی ریاست کا تصور ہے اور دوسری طرف فوج کو زیادہ سے زیادہ خوں خوار بنانے کا ایجنڈا۔ اب یہ دونوں ہی خطرے میں ہیں۔

حماس سے جنگ بندی کے بارے میں بات چیت کے باوجود اسرائیلی وزیراعظم نے صاف کہہ دیا ہے کہ جنگ بندی کا کوئی بھی معاہدہ عارضی ہوگا۔ اگر جنگ بندی میں توسیع ہو یا بنیامین نیتن یاہو کو منصب چھوڑنا پڑے، تب بھی فوج کو زیادہ طاقتور بنانے کے حوالے سے بھرپور سیاسی حمایت موجود ہے۔

اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جنگ اندازوں اور توقعات سے زیادہ مہنگی ثابت ہو رہی ہے۔ اکتوبر اور دسمبر کے درمیان اسرائیلی معیشت گزشتہ تین ماہ کے مقابلے میں سالانہ شرح کی بنیاد پر ۲۰ فیصد تک سکڑ گئی۔ یہ سکڑاؤ اسرائیل کے مرکزی بینک کے اندازے سے دُگنا ہے۔ اس دوران ساڑھے سات لاکھ افراد یا یوں کہیے کہ اسرائیلی افرادی قوت کا تقریباً ۱۷؍فیصد کام سے محروم رہا۔ ان میں سے بیشتر نقل مکانی کرنے والے یا محفوظ افرادی قوت کا حصہ تھے۔ گزشتہ ماہ ریٹنگ ایجنسی موڈی نے پہلی بار اسرائیل کی کریڈٹ ریٹنگ گھٹائی۔ ایسے میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیا اسرائیل مکمل جنگ کا متحمل ہوسکتا ہے؟

بنیادی مسئلہ مالیات کا ہے۔ ۷؍اکتوبر کو حماس کے حملوں سے قبل جی ڈی پی کے مقابلے میں اسرائیلی قرضوں کا تناسب ۶۰ فیصد تھا جو یورپ کے متمول ملکوں کے تناسب سے کم تھا۔ تین ماہ میں اسرائیلی فوج نے کم وبیش ۸؍ارب ڈالر (یعنی جی ڈی پی کا ۲ فیصد) حماس کے خلاف فوجی کارروائیوں پر پھونک ڈالے۔ سوال صرف فوج کے بڑھتے ہوئے بجٹ کا نہیں بلکہ نقل مکانی کرنے والوں کو بسانے کا بھی ہے۔ اور پھر محفوظ افرادی قوت کو بھی کچھ نہ کچھ دینا ہوتا ہے۔ اسرائیلی کے پالیسی ساز سوچتے ہیں کہ جی ڈی پی کے مقابلے میں قرضوں کا تناسب ۶۶ فیصد تک ہو تو کام چلایا جاسکتا ہے۔ اسرائیل کے سالانہ بجٹ میں خسارے کا ہدف جی ڈی پی کے ۶ء۶ فیصد تک رکھا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں جی ڈی پی کے مقابلے میں قرضوں کا تناسب ۷۵ فیصد تک ہوسکتا ہے۔

امریکا اور جاپان کے لیے اس حد تک قرضے تازہ ہوا کے جھونکوں جیسے ہوں گے۔ اسرائیل کا معاملہ مختلف ہے۔ اُسے بیرونی سطح پر غیر معمولی عسکری مناقشے کا سامنا ہے۔ اگر ملک کی ٹیک انڈسٹری نشانے پر آئی اور زخمی ہوئی تو علاقائی قوتوں کے شامل ہونے کی صورت میں لڑی جانے والی جنگ کی صورت میں ملک کا ایک چوتھائی انکم ٹیکس داؤ پر لگ جائے گا۔ گزشتہ بار جب اسرائیل نے مکمل جنگ لڑی تھی تب یعنی ۱۹۷۳ء میں جی ڈی پی کے مقابلے میں قرضوں کا تناسب ۱۰۰؍فیصد ہوگیا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت بڑا مالیاتی بحران پیدا ہوا تھا۔ کرنسی نوٹ چھاپنے کی رفتار تیز ہوئی تو بینکنگ کا شعبہ الٹ پلٹ گیا اور ۱۹۸۵ء میں افراطِ زر کی شرح ۴۵۰ فیصد تک جا پہنچی۔ بونڈ ہولڈرز کو مطمئن رکھنے کے لیے اسرائیلی حکومت کو اب بہت کچھ کرنا پڑے گا۔

اب بہت سوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کا بجٹ خاصا پُرتعیش ہے۔ بحرانی کیفیت میں حکومتیں معاملات کو چلتا رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قرضے لیتی رہی ہیں تاہم اسرائیلی حکومت دانشمند ہے کہ سادگی کو اپنانے کی بات کر رہی ہے۔ فوج کا بجٹ بڑھانا ضرور ہے تاہم اس میں بھی حد سے نہیں گزرنا ہے اور جنگ سے پہلے کے دور کی حد کو پار نہیں کرنا ہے۔ اب حکومت کے لیے ایک بڑا امتحان یہ ہے کہ قرضوں کو بھی قابو میں رکھے اور اخراجات کو بھی برداشت کرے۔

۲۰۲۲ء میں اسرائیلی حکومت نے جو ٹیکس وصول کیے وہ جی ڈی پی کا ۳۳ فیصد تھے۔ اقتصادی تعاون وترقی کی تنظیم (OECD) کے رکن ممالک میں یہ تناسب ۳۴ فیصد ہے۔ اس کے باوجود اسرائیلی بجٹ میں معمولی نوعیت ہی کے اضافے شامل ہیں۔ اگلے سال ویلیو ایڈیڈ ٹیکس ایک پرسنٹیج پوائنٹ کے ذریعے ۱۸؍فیصد ہو جائے گا۔ تمام آمدنی پر ہیلتھ ٹیکس میں اضافہ ۱۵ء۰ فیصد ہوگا۔ پالیسی ساز یہ محسوس کر رہے ہیں کہ کارپوریٹ ٹیکس بڑھانے کی صورت میں ٹیک سیکٹر، جو پہلے ہی بہت حرکت پذیر ہے اور معیاری افرادی قوت کی کمی کا شکار ہے، ملک سے بھاگ جائے گا۔ اگر گھریلو بنیاد پر ٹیکس بڑھایا گیا تو صَرف گھٹے گا اور جنگ کے باعث مشکل زندگی بسر کرنے والوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔

مقبوضہ بیت المقدس کے مضافات میں سیکولر پروفیشنل خاندان، جن کے ارکان کو فوج میں خدمات کی انجام دہی کے لیے طلب کیا گیا ہے اور جن کی آمدنی بھی کم ہوگئی ہے، شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ عرب آبادیوں میں بیشتر کا کہنا ہے کہ اُن کے لیے روزگار کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں۔ بنیامین نیتن یاہو کے دورِ حکومت میں سب سے زیادہ ان عرب باشندوں کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ اِن سے کچھ ہی دُور الٹرا آرتھوڈوکس خاندان رہتے ہیں جن پر فوج میں خدمات انجام دینا لازم نہیں اور وہ حکومت کی طرف سے ملنے والی اعانت پر پلتے ہیں۔ حالات کی خرابی کا ان پر برائے نام اثر پڑا ہے۔

صنعتوں پر بھی حالات کی خرابی کے اثرات برابر نہیں۔ کہیں کم ہیں تو کہیں زیادہ۔ اسرائیل کے ٹیک سیکٹر کو زیادہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ہائی ٹیک کے چند اداروں کا خیال ہے کہ وہ حکومت سے معاہدوں کی شکل میں تھوڑا بہت منافع کما سکتے ہیں۔ ہائی ٹیک کے بہت سے اداروں نے اپنا سرمایہ اور کام کاج بیرونِ ملک منتقل کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اُنہیں ایک بات کا اطمینان ضرور رہتا ہے۔۔۔ یہ کہ اُن کے ملازمین کو چھین کر فوجی خدمت پر نہیں لگایا جائے گا۔ اسرائیل کی ایک بڑی سائبر سیکیورٹی کمپنی سائبر آرک کے چیئرمین بِٹان کہتے ہیں کہ ہماری پیداواری صلاحیت بہتر ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے ملازمین سے کہا ہے کہ معیشت یہ جنگ جیت لے گی۔ مقامی سطح پر ٹیک سیکٹر میں سرمایہ کاری گھٹی ہے۔ پھر بھی سرمایہ کاری کا معاملہ یورپ جیسا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری میں کمی کا جنگ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

معیشت کے دیگر شعبے شدید دباؤ کا سامنا کر رہے ہیں۔

تعمیرات کی صنعت بالکل تھم کر رہ گئی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد نصف رہ گئی ہے۔ سیاحت کی صنعت سے وابستہ اداروں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ جنوری ۲۰۲۴ء میں مقبوضہ بیت المقدس آنے والے سیاحوں کی تعداد گزشتہ برس جنوری کے مقابلے میں ۷۷ فیصد کم تھی۔

معاشی بحالی کا عمل سست رفتار ہوسکتا ہے۔ غزہ کے معاملے نے اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان مناقشے کو مزید بگاڑ دیا ہے۔ اسرائیلی معیشت کی عمدہ کارکردگی کا مدار اصلاً فلسطینی علاقوں سے ملنے والی سستی افرادی قوت پر ہے۔ غربِ اردن کے علاقے اب بھی اسرائیل سے اُتنا ہی مال درآمد کرتے ہیں جتنا کرتے آئے ہیں، وہاں سے ۲ لاکھ افراد کام پر اسرائیل نہیں آسکتے جو اسرائیلی افرادی قوت کا ۵ فیصد ہے۔ اسرائیل نے ۷/اکتوبر کے بعد اُن کے ورک پرمٹ منسوخ کردیے۔ اب اُنہیں دوبارہ کام پر آنے سے منع کیا جارہا ہے۔ کھیتوں، فیکٹریوں اور عمارتوں میں کام کرنے والوں کی شدید کمی ہے۔ بیشتر صنعت کار شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ مسئلہ حل کیسے کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ فلسطینیوں کی ضرورت ہے مگر اُن پر منحصر نہیں رہا جاسکتا۔

اسرائیل میں افرادی قوت کا معاملہ پہلے ہی بہت پریشان کن ہے۔ بیرونِ ملک سے محنت کشوں کو لانے کا عمل سُست رفتار اور مہنگا ہے اور ملک کی افرادی قوت آبادی کے نصف سے کم ہے۔ تعداد کے لحاظ سے تیزی سے پنپتی ہوئی ملک کی الٹرا آرتھوڈوکس آبادی میں نصف سے زیادہ افراد مختلف مذہبی وجوہ کی بنیاد پر کام کرنے سے انکاری ہیں۔ ان میں سے بیشتر کم تعلیم یافتہ اور مذہبی اسکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ عرب نسل کے اسرائیلی بھی، جو شرحِ پیدائش کے اعتبار سے دوسرا بڑا گروہ ہیں، امتحانات میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ جنوری میں آرتھوڈوکس کے سوا تمام مردوں کے لیے لازمی فوجی خدمات ۳۲ ماہ سے بڑھا کر ۳۶ ماہ کردی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افرادی قوت مزید گھٹ جائے گی۔

معیشتی ابتری کے ساتھ ساتھ اگر قرضے بڑھتے گئے تو معاملات مزید پیچیدہ ہوجائیں گے۔ یوم کپور کی جنگ (۱۹۷۳ء) کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اب ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اسرائیلی وزارتیں ٹیکنوکریٹس سے بھری ہوئی ہیں۔ عوام بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی سلامتی کا مدار معاشی استحکام پر ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ غیر ذمہ دار سیاست دانوں کو فارغ کیا جائے۔

فی الحال ملک کے دیوالیہ ہونے کا تو کوئی امکان نہیں۔ حکومت کے لیے قرضوں کا حصول اس وقت بہت مہنگا سَودا ہے تاہم دوسرے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں یہ سیاست دانوں کے لیے بہت بھاری قیمت چُکانے والا معاملہ نہیں۔ مارکیٹ کے تمام اشاریے کسی زیادہ خطرناک صورتحال کی نشاندہی نہیں کررہے۔

معیشت سے جُڑی ہوئی تمام قوتوں (بازاروں) کو یقین ہے کہ حکومت قرضوں پر سُود ادا کرنے کے لیے افراطِ زر کا سہارا نہیں لے گی۔ امریکا میں افراطِ زر کی شرح ۳ فیصد ہے جبکہ اسرائیل میں اِس سے کم ہے۔ اس میں مزید کمی متوقع ہے۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد سے اسرائیل میں اسٹیٹ بینک افراطِ زر کو نشانہ بناتا رہا ہے۔ اسرائیلی مرکزی بینک انتہا پسند رجحان کا حامل ہے۔ ۷/اکتوبر کے بعد اِس نے زرمبادلہ کے ذخائر سے ۳۰/ارب ڈالر سے زائد خرچ کیے تاکہ ملکی کرنسی شیکل کو استحکام ملے۔ اور اگر ملک کو مزید ضرورت پڑے تو اِس کے پاس مزید ۱۷۰/ارب ڈالر پڑے ہیں۔

اگر کسی بڑے معاشی بحران کا سامنا نہیں بھی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مشکلات کم ہوجائیں گی یا محسوس نہیں ہوں گی۔ مشکلات دوسری شکلوں میں آئیں گی۔ معاشی استحکام یقینی بنانے کے لیے حکومت کو بہت سے اخراجات کم کرنا ہوں گے۔ جو دولت بنیامین نیتن یاہو کی مخلوط حکومت کو جوڑ کر رکھتی ہے، اُس کی حفاظت اُس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ وزیراعظم ہیں۔ جنگی بجٹ سے ظاہر ہے کہ اسرائیل میں فلاحی ریاست کا ڈھانچا زد میں آئے گا۔ اقتصادی تعاون و ترقی کی تنظیم میں بیروزگاری کی کم ترین شرحوں میں سے ایک کی حامل ہونے کے باوجود اسرائیل بے روزگاری الاؤنس دینے کے معاملے میں پانچواں بڑا خرچ کرنے والا ملک ہے۔ صرف ناروے اور آئس لینڈ کی حکومتیں جی ڈی پی میں سے تعلیم پر اسرائیل کے مقابلے میں زیادہ خرچ کرتی ہیں۔ ایسے میں بنیامین نیتن یاہو کی مشکلات بڑھتی ہی جائیں گی کیونکہ اُنہیں بچت بھی درکار ہے اور مخلوط حکومت میں اتحادیوں کو بھی خوش رکھنا ہے۔

وزارتِ بہبود، جو نقل مکانی کرنے اور واپس آنے والے یرغمالیوں کا خیال رکھتی ہے، اپنے بجٹ میں ۸ فیصد کمی کا سامنا کرے گی۔ دیگر سویلین وزارتوں کے بجٹ میں کی جانے والی کٹوتی اِس سے کم ہے۔ اس وزارت پر ملک کے شمال اور جنوب سے نقل مکانی کرنے والے ایک لاکھ ۳۵ ہزار افراد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہے۔ اس وزارت نے اب تک ہوٹلوں کے بل ادا کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ اب یہ وزارت نقل مکانی کرنے والے خاندانوں سے کہہ رہی ہے کہ اپنے گھروں میں دوبارہ آباد ہوں۔ اگر اسرائیل بنیامین نیتن یاہو کی بداِنتظامی کی نذر رہا تو دیگر وزارتیں بھی ایسی ہی ٹریمنٹ کا شکار ہوں گی۔ اگر وہ مستعفی بھی ہوتے ہیں تو اسرائیل کو اپنے عمرانی معاہدے کے دو بڑے ستونوں (مسلح افواج اور فلاحی ریاست) میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے گا۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Can Israel afford to wage war?"
("The Economist". March 5, 2024)

●●●

بقیہ: یہ ساری خرابیاں کس کھاتے میں؟

مشرقِ وسطیٰ کی خرابیاں افریقا اور ایشیا دونوں پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہاں پیدا ہونے والا خلفشار عالمی معیشت کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے یا بنادیا جاتا ہے۔ یہ بات ناقابلِ فہم نہیں کہ اسرائیل اُتنا طاقتور نہیں جتنا اُسے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کوئی چھوٹا سا ملک پورے خطے پر یوں اثر انداز نہیں ہوسکتا جس طور اسرائیل اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہ بات سمجھنا کسی کے لیے دشوار نہیں کہ اسرائیل کے ذریعے مغربی طاقتیں عالمی معاملات کو اپنی مرضی کی سمت موڑتی ہیں۔ کھیلوں کی دنیا میں اِسے ٹائم آؤٹ کہا جاسکتا ہے۔

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دوسروں کے گھر میں آگ لگا کر اپنے لیے گرمی اور روشنی کا اہتمام کرنے کی روش مغرب کب ترک کرے گا۔ امریکا اور یورپ میں بہت سے حلقے اب اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے پالیسیاں تبدیل کی جائیں اور اسرائیل کی بے جا حمایت کے ذریعے خرابیاں پیدا کرنے کی روش ترک کی جائے۔ اس معاملے میں یورپ قدرے قابلِ قبول روش پر گامزن ہے۔

چین اور روس کو کنٹرول کرنے کے نام پر باقی دنیا کو خلجان میں مبتلا کرنے کا ڈراما اب بند ہونا چاہیے۔ مغرب کو اگر اپنی بالادستی خطرے میں پڑتی دکھائی دے رہی ہے اور شکست کا امکان نمایاں ہوچلا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کھیل کا میدان ہی اجاڑ دیا جائے۔ حقیقت پسندی کی روش پر گامزن ہوکر دنیا کو ڈھنگ سے چلانے میں مغرب معقول کردار ادا کرسکتا ہے۔

●●●

مودی جنوبی بھارت کو جیت پائیں گے؟

میدان سج چکا تھا۔ سب کچھ تگڑے بیل نریندر مودی کے حق میں تھا۔ بھارت کی جنوبی ریاست تامل ناڈو میں یہ میدان بیل کو قابو میں لانے کے مقابلے کا تھا۔ ایک بیل کو بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی سے موسوم کیا گیا تھا۔ ایک نوجوان نے نریندر مودی کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوگیا۔

بیل کے مالک انا ملائی نے بتایا کہ وہ بہت جارحانہ مزاج رکھتا ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ گردوپیش رونما ہونے والی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔

یہی اپروچ ۳۹ سالہ انا ملائی نے سیاست میں اپنائی ہے۔ وہ تامل ناڈو میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ہیں۔ مئی میں بھارت عام انتخابات کا انعقاد کرنے والا ہے۔ ایسے میں انا ملائی بھی وزیراعظم نریندر مودی کی سیاسی اور معاشی ترجیحات کا حصہ ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کا مسلسل دوسرا دورِ اقتدار جاری ہے۔ وہ شمالی بھارت کی متعدد غریب ریاستوں میں بھی حکمران ہے۔ اب وہ بھارت کے جنوب کی متمول ریاستوں میں بھی داخل ہونے اور قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ریاستیں تعلیم یافتہ ہیں اور معاشی استحکام سے ہم کنار بھی۔ اِنہیں بھارت کا معاشی انجن بھی کہا جاسکتا ہے۔ انا ملائی کو جنوبی بھارت میں بی جے پی کے قدم جمانے کا ٹاسک سونپا جاچکا ہے۔

انا ملائی سات ماہ سے جنوبی ریاستوں میں ریلیوں کی قیادت اور جلسوں سے خطاب کر رہے ہیں۔ انہوں نے انتھک محنت کی ہے۔ ان کی سات ماہ کی محنت کا نقطۂ عروج و اختتام ۲۷ فروری کو اس وقت دکھائی دیا جب تامل ناڈو کے مغربی حصے میں وزیراعظم نریندر مودی نے ایک ریلی کی قیادت کی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے تامل ناڈو میں بڑے پیمانے پر رابطہ مہم جنوری میں شروع کی۔ ویسے وہاں تین سال سے بی جے پی کے قدم مضبوط کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس دوران ہزاروں سرگرمیوں کا ریکارڈ ملتا ہے۔ ایک سال کے دوران وزیراعظم مودی نے ۱۷ بار جنوبی ریاستوں کا دورہ کیا ہے۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ شاید وہ تامل ناڈو سے لوک سبھا کی کسی نشست کے لیے امیدوار بھی ہوں۔ اس وقت نریندر مودی بنارس کی نشست پر لوک سبھا کے امیدوار ہیں۔ بنارس شمالی بھارت میں ہے اور آبادی کے لحاظ سے ملک کی سب سے بڑی ریاست کا شہر ہے۔ تامل ناڈو جنوب میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑی ریاست ہے۔

شمالی بھارت میں بی جے پی انتہا پسندی کی بات کرتی ہے اور انتہا پسندی بھی وہ جو مسلمانوں کے خلاف ہو۔ شمالی بھارت کے بیشتر حصوں میں بی جے پی کو مسلم مخالف جذبات بھڑکانے پر ووٹ ملتے ہیں۔ جنوب میں بی جے پی کا ایجنڈا کچھ اور ہے۔ یہاں بی جے پی صرف ترقی کی بات کرتی ہے۔ مسلم مخالف قوم پرستی یہاں نہیں چلتی، اس لیے بی جے پی چلانے کی کوشش بھی نہیں کرتی۔

بی جے پی جنوبی بھارت کو مسخر کرنے کے لیے بے تاب ہے مگر اس کا بنیادی مقصد سیاسی مقاصد کا حصول ہے۔ جنوبی بھارت کی ریاستوں کو رجھانے کے لیے بی جے پی اپنا من پسند فارمولا اختیار نہیں کرتی۔ یہ فارمولا ہے ہندو انتہا پسندی۔ شمالی، مغربی اور وسطی بھارت میں بی جے پی انتہا پسندی اپنا کر ووٹ بینک مضبوط کرتی ہے۔ مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کو نشانے پر لے کر عام ہندو کو ڈرایا جاتا ہے اور یوں زیادہ سے زیادہ ووٹ بٹورے جاتے ہیں۔ جنوبی بھارت کی ریاستوں میں یہ منجن نہیں بکتا۔ وہاں لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور مجموعی طور پر سلجھے ہوئے مزاج کے حامل ہیں۔ شمالی اور وسطی بھارت میں ہندی بولی جاتی ہے۔ جنوبی بھارت میں ریاستوں کی اپنی زبانیں ہیں اور وہ زبان کے معاملے میں بہت حساس ہیں۔

جنوبی بھارت میں بی جے پی انتہا پسندی کی بات کرتی ہے نہ مسلم مخالف جذبات کی۔ تو کیا سیاسی فوائد کے حصول کے لیے وہ قومی یکجہتی کے نام پر اپنے نام نہاد نظریاتی مقاصد کی قربانی دینے کو تیار ہے؟

جنوبی بھارت کی ریاستوں میں غیر معمولی انتخابی کامیابی بی جے پی کے لیے اب تک ایک خواب ہی رہی ہے۔ ۲۰۱۹ء کے عام انتخابات میں بی جے پی نے جنوبی بھارت کی پانچ ریاستوں کی ۱۲۰ میں سے صرف ۲۹ نشستیں حاصل کی تھیں اور دو ریاستوں میں تو اُسے لوک سبھا کی ایک بھی نشست نہیں ملی تھی۔

اب بی جے پی نے کرناٹک، تامل ناڈو، تلنگانہ، آندھرا پردیش اور کیرالا میں بھی بھرپور انتخابی کامیابی کے لیے کمر کس لی ہے۔ شمالی اور وسطی بھارت میں بھی وہ اپنی کامیابی زیادہ وسیع البنیاد بنانا چاہتی ہے تاہم جنوبی بھارت کو وہ ایک بڑے چیلنج کے طور پر لے رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ یہاں بھرپور کامیابی یقینی بنائے تاکہ پورے ملک پر اس کا بھرپور اختیار ہونے کا تاثر مضبوط ہو۔

جنوبی بھارت پر متوجہ ہونے کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ بی جے پی اپنی حقیقی حریف کانگریس کو سیاست سے نکال باہر کرنا چاہتی ہے۔ جنوبی بھارت میں کانگریس کی وہ پوزیشن بہرحال نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی مگر اس کے باوجود گزشتہ برس ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں کانگریس نے کرناٹک اور تلنگانہ میں کامیاب ہوکر حکومت بنائی۔

جنوبی بھارت کو مسخر کرنے کی خواہش کی پشت پر یہ حقیقت بھی کارفرما ہے کہ بھارت کی معاشی ترقی میں جنوبی ریاستوں کا کردار کلیدی نوعیت کا ہے۔ نریندر مودی یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ ملک کو حقیقی معاشی ترقی کی راہ پر انہوں نے ڈالا ہے۔ وہ کاروبار کے لیے مستحکم ماحول یقینی بنانے کے حوالے سے بلند بانگ دعوے کرتے رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بھارتی معیشت کو تیزی اور مضبوطی سے ہم کنار کرنے میں کلیدی کردار صرف بھارت کی جنوبی ریاستوں کا ہے۔ یہ تمام ریاستیں خواندگی کے اعتبار سے باقی بھارت سے بہت آگے ہیں۔ ان ریاستوں کے باشندے اعلیٰ تعلیم پاکر بیرونِ ملک جاتے ہیں اور ملک کو خطیر زرِمبادلہ بھیجتے ہیں۔

کرناٹک کا دارالحکومت بنگلور اور تلنگانہ کا دارالحکومت حیدرآباد دکن جدید ترین ٹیکنالوجی کے مراکز ہیں۔ بنگلور کو بھارت کا آئی ٹی دارالحکومت کہا جاتا ہے۔ اس شہر میں بھارت کی تمام بڑی ٹیک کمپنیوں کے علاوہ ایمیزون اور مائیکروسوفٹ جیسے ٹیک جائنٹس کے بھی دفاتر ہیں۔ بھارت بھر میں ٹیکنالوجی کے حوالے سے غیر معمولی حیثیت کے حامل سمجھے جانے والے ۴۶ فیصد ادارے جنوب میں ہیں۔ ملک کی ۶۶ فیصد آئی ٹی برآمدات کا تعلق بھی جنوب سے ہے۔ بھارت میں امریکا کی بڑی ٹیکنالوجی کمپنی کے ۱۴ سپلائرز ہیں جن میں سے ۱۱ جنوب میں ہیں۔

حیدرآباد دکن اور بنگلور کے علاوہ تامل ناڈو کا دارالحکومت چنئی (مدراس) بھی غیر ملکی کمپنیوں کے لیے انتہائی پُرکشش ہیں۔ وہ گلوبل کیپیبلیٹی سینٹر قائم کرنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ اِن ہاؤس بیک آفس خدمات کی فراہمی کے لیے

دنیا بھر کے بڑے ٹیک ادارے اِن تینوں شہروں کو ترجیح دے رہے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنی لاگت میں اچھی خاصی کمی لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ملک بھر میں ایسے مراکز کا ۷۹ فیصد جنوب میں ہے۔

بھارت میں مینوفیکچرنگ سیکٹر بھی اب تک مضبوط ہے۔ یہ سیکٹر بہت بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ بھارت کی کم و بیش ۱۶ فیصد فیکٹریاں تامل ناڈو میں ہیں جو اِسے معیشت کا ایک بڑا ستون بناتی ہیں۔

بھارت کی ۲۰ فیصد آبادی جنوب کی پانچ ریاستوں میں ہے۔ ۲۶ فیصد آبادی شمال کی ریاستوں اتر پردیش اور بہار میں ہے۔ جنوب میں فی کس آمدن زیادہ ہے اور لوگ مجموعی طور پر بہت اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جنوب میں نوزائیدہ بچوں میں شرحِ اموات اتر پردیش اور بہار کے مقابلے میں نصف ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان پانچ ریاستوں میں صحتِ عامہ کا نظام بہت اچھی حالت میں ہے۔ جنوبی بھارت کی ریاستوں میں ۱۵ سے ۴۹ سال تک کی خواتین میں خواندگی کا تناسب ۸۶ فیصد ہے جو بھارت بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اتر پردیش اور بہار میں یہ تناسب ۷۰ فیصد ہے۔

بھارت میں شمال اور جنوب کے درمیان ثقافتی تقسیم بھی بہت زیادہ ہے۔ بی جے پی چاہتی ہے کہ ملک بھر میں ہندی کو قومی زبان بنایا جائے۔ وہ اردو کے شدید خلاف ہے کیونکہ اِسے وہ مسلمانوں کے غلبے کی ایک نشانی سمجھتی ہے۔ جنوبی بھارت کے لوگ اپنی زبانوں پر کسی بھی زبان کو ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں۔ اس حوالے سے وہاں سماجی تحرک اچھا خاصا ہے۔ جنوبی بھارت میں اسلام بہت پہلے آیا تھا اور قدرے پُرامن طریقے سے پھیلا تھا۔ وہاں قتل و غارت بھی کم ہوئی تھی۔ ایسے میں جنوبی بھارت کے لوگ اسلام کے حوالے سے بی جے پی کی پھیلائی ہوئی باتوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ جنوبی بھارت کی ریاستیں ہندوازم کو جدت سے ہم کنار کرکے اپنی مقامی شناخت قائم کرنے کے حوالے سے قابلِ رشک تاریخ کی حامل ہیں۔

تامل ناڈو میں بی جے پی کے لیے کھیر بہت ٹیڑھی ہے۔ تامل ناڈو میں کم و بیش ۶ عشروں سے دراوڑین تحریک حاوی رہی ہے جو برہمن ازم کے خلاف ردِعمل کی شکل میں نمودار ہوئی تھی۔ تامل ناڈو میں بیورو کریسی برہمنوں کے ہاتھ میں نہیں۔ ذات پات کے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بھرپور خواہش جنوبی بھارت کی تمام ریاستوں اور بالخصوص تامل ناڈو میں غیر معمولی طور پر مستحکم ہے۔ ماضی میں دراوڑین قائدین نے آزادوطن کے لیے بھی جدوجہد کی تھی۔

اقتدار پر دراوڑین پارٹیوں کی گرفت کمزور کرنے کے لیے بی جے پی نے ۲۰۲۱ء میں انا ملائی کو تامل ناڈو میں اپنا سربراہ بنایا۔ انہوں نے اس منصب پر فائز کیے جانے سے دو سال قبل پولیس کے محکمے سے استعفیٰ دیا تھا۔ وہ نچلی ذات کے غریب ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے نوجوان ووٹرز کو متحرک کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ دیہی علاقوں میں ان کی کوششیں زیادہ بارآور ثابت ہوئی ہیں۔ جنوبی بھارت میں تاثر عام ہے کہ بھارت پر شمالی بھارت کے برہمن راج کرتے ہیں۔ اس تاثر کو ختم کرنے کے لیے بی جے پی کھل کر میدان میں آئی ہے۔

ہندی کے معاملے میں بی جے پی کو بہت محتاط رہتے ہوئے کام کرنا پڑا ہے۔ جنوبی بھارت میں ہندی کو قومی زبان کے طور پر اپنانے کی تحریک ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ تامل ناڈو میں ۱۹۶۵ء میں خوں ریز لسانی فسادات بھی ہوئے تھے۔

نریندر مودی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ عوام کے جذبات سے کس طور کھیلنا ہے۔ انہوں نے ۲۷ فروری کو تامل ناڈو میں ریلی سے خطاب کے دوران ہندی کا بھول کر بھی حوالہ نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ اُنہیں مقامی زبانوں سے بہت محبت ہے۔ انہوں نے تامل ناڈو کے عوام کو یاد دلایا کہ انہوں نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے دوران تامل ناڈو کے چھٹی صدی عیسوی کے ایک شاعر کی نظم کا حوالہ دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے ایودھیا، اتر پردیش میں تعمیر کیے جانے والے رام جنم بھومی مندر کے افتتاح کا بھی حوالہ نہیں دیا جبکہ اتر پردیش اور دیگر شمالی، مغربی اور وسطی ریاستوں میں جلسوں سے خطاب کے دوران وہ ایودھیا کے رام مندر کی تعمیر کا سہرا اپنے اور بی جے پی کے سر بندھوانے میں پیش پیش رہے تھے۔ انہوں نے تامل ناڈو کی تعمیر و ترقی میں مرکزی حکومت کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے تامل ناڈو میں آجرانہ رجحانات کو بھی سراہا۔

تامل ناڈو سمیت تمام ہی جنوبی ریاستوں کے سیاسی قائدین کو یہ شکایت رہی ہے کہ مرکز اُن سے جو گڈز اینڈ سروسز ٹیکس لیتی ہے، اس میں برائے نام ہی اُنہیں واپس مل پاتا ہے۔ انہوں نے فروری میں اس حوالے سے نئی دہلی میں احتجاج بھی کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ محصولات سے ہونے والی آمدنی کو ریاستوں میں تقسیم کرنے کے معاملے میں مودی سرکار انصاف سے کام نہیں لے رہی۔ جنوبی بھارت کی ریاستوں کے قائدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ انہوں نے فیملی پلاننگ کا تصور کامیابی سے اپنایا ہے اس لیے مرکزی حکومت انہیں نشانہ بنا رہی ہے۔

شمالی اور جنوبی بھارت کے درمیان انتخابی حلقہ بندیوں کا بھی مسئلہ موجود ہے۔ ۲۰۲۶ء کے بعد نئی حلقہ بندیاں کی جانی ہیں۔ اس حوالے سے پائی جانے والی کشیدگی بھی معاملات کو بگاڑ رہی ہے۔ بی جے پی معاملات کو اپنے حق میں کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ زور لگا رہی ہے۔ لوک سبھا کی نشستوں کو ۵۴۳ کی سطح سے ۷۵۳ تک لے جانے کی پلاننگ کی جارہی ہے اور بی جے پی چاہتی ہے کہ شمالی بھارت کو زیادہ نشستیں دی جائیں۔ تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ ایم کے اسٹالن اس معاملے میں بہت جذباتی ہیں اور جارحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی حد بندیوں کی تلوار تامل ناڈو کے سر پر لٹک رہی ہے۔

بی جے پی قیادت کو یقین ہے کہ جب تک نریندر مودی ہیں تب تک وہ جنوبی بھارت کی ریاستوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب رہے گی۔ حد بندی کے مسئلے پر بہت توجہ دی جارہی ہے تاکہ جنوبی بھارت کی کوئی بھی ریاست یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی حق تلفی کی جارہی ہے۔

کرناٹک میں بی جے پی قدم جمانے میں بہت حد تک کامیاب رہی ہے تاہم گزشتہ برس وہ ریاستی اسمبلی کا الیکشن ہار گئی۔ پھر بھی وہ پُرامید ہے کہ لوک سبھا کے انتخابات میں وہ کرناٹک میں اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن بحال کرنے میں کامیاب رہے گی۔ کرناٹک اسمبلی کا الیکشن بدعنوانی اور مسلم دشمنی کی بنیاد پر ہارنے کے بعد بی جے پی اب حکمتِ عملی بدل رہی ہے۔ حجاب کے مسئلے نے کرناٹک اسمبلی بی جے پی کے ہاتھ سے چھین لی۔

بی جے پی تلنگانہ میں چند نشستیں حاصل کرسکتی ہے۔ وہاں کانگریس نے گزشتہ سال ریاستی اسمبلی کا الیکشن جیت کر حکومت بنائی ہے تاہم بی جے پی کے ووٹوں کا شیئر دگنا ہوکر ۱۴ فیصد ہو چکا ہے۔ کیرالا میں اِس وقت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کی حکومت ہے۔ وہاں بی جے پی ایک دو نشستیں جیت سکتی ہے۔ آندھرا پردیش میں بی جے پی مقامی جماعتوں سے مل کر اتحاد بنا سکتی ہے۔ تامل ناڈو میں مقابلہ سخت ہوگا۔ لوک سبھا میں اُس کی نشستیں ۳۹ ہیں۔ وہاں

باقی صفحہ نمبر ۱۶

مودی کا دورہ سرینگر اور انتخابی بگل

افتخار گیلانی

بھارت میں جلد ہی عام انتخابات کا بگل بجنے والا ہے۔ امید ہے کہ اپریل اور مئی میں کئی مرحلوں میں ان کو مکمل کیا جائے گا۔ ویسے تو حکمران ہندو قوم پرست بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) ہمیشہ ہی انتخابی مہم کے موڈ میں رہتی ہے مگر اس بار ۷ر مارچ کو سرینگر کے بخشی اسٹیڈیم میں عوامی جلسہ سے خطاب کرکے وزیراعظم نریندر مودی نے یہ عندیہ دیا ہے کہ ووٹروں کو لبھانے کے لیے کشمیر کا بھرپور استعمال کیا جائے گا۔ ۲۰۱۹ء کے انتخابات میں پاکستان کو سبق سکھانے کو انتخابی موضوع بنایا گیا تھا۔ گو کہ بھارت کے وزرا اعظم سرینگر آتے ہی رہتے ہیں، مودی کے پیش رو من موہن سنگھ نے اپنے دس سالہ دور اقتدار میں چار بار سرینگر کا دورہ کیا۔ مودی نے اس سے قبل ۲۰۱۵ء میں اس وقت کے وزیراعلیٰ مفتی محمد سعید، جن کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے ساتھ انہوں نے ریاست میں مخلوط حکومت بنائی تھی، کی معیت میں سرینگر میں عوامی ریلی سے خطاب کیا تھا۔ مگر اس بار مودی جی کے دورے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس خطے کی خصوصی حیثیت ختم کرنے کے بعد ان کا سرینگر کا پہلا دورہ تھا۔

۱۹۸۳ء میں کانگریس نے جب فاروق عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے خلاف انتخابات میں پوری طاقت جھونک دی گئی تھی تو اس انتخابی مہم کی کمان وزیراعظم اندرا گاندھی نے خود ہی سنبھالی تھی۔ وہ ایک کھلی جیپ میں ہمارے گھر کے سامنے سے ہی گزر کر جلسہ گاہ میں پہنچیں۔ مودی کی ریلی کے حوالے سے جموں و کشمیر روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ایک عہدیدار نے خود اعتراف کیا کہ شرکاء کو لے جانے کے لیے ۹۰۰ سرکاری بسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سے قبل یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ تقریباً ۷۰۰۰ سرکاری ملازمین، اساتذہ اور جے اینڈ کے بینک کے عملے کو ریلی میں شرکت کا حکم دیا گیا تھا، انہیں فجر سے پہلے مختلف مخصوص جگہوں پر جمع ہونے کو کہا گیا تھا، جہاں سے انہیں بسوں میں لاد کر اسٹیڈیم پہنچایا گیا تھا۔ ان میں سے ۱۴۵ر بسیں بارہ مولہ ضلع سے لوگوں کو جلسہ گاہ تک پہنچانے کے لیے وقف کی گئی تھیں۔ جس طرح ماضی میں اندرا گاندھی کے دور میں کانگریس کو شوق چرایا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے وادی کشمیر سے سیٹیں جیت کر ایک طرح کا پیغام دیا جائے، وہی شوق اب مودی کے دور میں بی جے پی نے پال رکھا ہے۔ وادی کشمیر میں داخلے کے لیے کانگریس بھی اپنی بھرپور طاقت جنوبی کشمیر یعنی اننت ناگ کی سیٹ حاصل کرنے کے لیے لگاتی تھی، بی جے پی بھی اسی سیٹ کو حاصل کرنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

کشمیر میں عوام کی اس دورہ کے تئیں دلچسپی کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو ایک سیاسی عمل کے احیا کا ذریعہ سمجھتے تھے اور سیاسی گھٹن سے چھٹکارہ چاہتے تھے۔ ۱۹۸۷ء کے اسمبلی انتخابات میں دھاندلیوں کے بعد عوام کا جمہوری نظام پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا اور ووٹر ٹرن آؤٹ عدم دلچسپی اور آزادی پسند پارٹیوں کے بائیکاٹ کال کی وجہ سے بہت ہی کم ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی حکومتی عہدوں جو افراد براجمان ہوتے تھے، وہ کسی حد تک ان کے مسائل سے آگاہ ہوتے تھے۔ ۲۰۱۸ء کے بعد یعنی پچھلے چند سال سے جموں و کشمیر کی انتظامیہ کو مرکزی بیورو کریسی چلا رہی ہے۔ اس وقت ۲۰ر اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں میں سے صرف آٹھ ہی مقامی ہیں۔ خطے کے ۱۱۲ر اعلیٰ پولیس افسران میں صرف ۲۴ مقامی ہیں، ان میں سے بھی تین ڈیپوٹیشن پر باہر ہیں۔ جموں و کشمیر چھ پارلیمانی نشستوں میں سے تین وادی کشمیر، دو جموں اور ایک لداخ کے لیے مختص کی گئی تھی۔ چونکہ اب لداخ کو علیحدہ کر دیا گیا ہے اس لیے یہ سیٹیں اب پانچ ہی رہ گئی ہیں۔

۲۰۱۸ء میں ہونے والے پنچایتی انتخابات کا نیشنل کانفرنس اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ وہ وزیراعظم سے شق ۳۷۰ اور اے۔ ۳۵ کو برقرار رکھنے کی یقین دہانی چاہتے تھے۔ اس وجہ سے بی جے پی نے غیر متعلقہ افراد کو کھڑا کرکے اور ان کو جتوا کر سیاسی کارکنوں کی ایک نئی پود پیدا کی، جو اب ان کو چیلنج دے رہے ہیں۔ گو کہ ان میں سے کئی تو مزاحیہ کردار لگتے ہیں۔ اس وقت ان دو بڑی مقامی پارٹیوں کے علاوہ سید الطاف بخاری کی اپنی پارٹی، غلام نبی آزاد کی ڈیموکریٹک آزاد پارٹی اور سجاد غنی لون کی پیپلز کانفرنس بھی میدان میں ہے۔ سابق ممبر اسمبلی انجینئر رشید، جو پچھلے پانچ سالوں سے دہلی کی تہاڑ جیل میں ہیں، کی عوامی اتحاد پارٹی بھی انتخابات میں اترنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ یعنی بی جے پی سمیت سات پارٹیاں انتخابات میں قسمت آزمائی کریں گی۔ چونکہ بی جے پی جنوبی کشمیر یعنی اننت ناگ سیٹ پر نظریں ٹکائے ہوئے ہے، اس لیے حد بندی کمیشن کے ذریعے اس کا حلیہ تبدیل کرکے رکھ دیا گیا ہے۔

اس میں اب جموں ڈویژن کے دو اضلاع یعنی راجوری اور پونچھ کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ دونوں اضلاع اس سے قبل جموں۔ توی سیٹ کا حصہ ہوتے تھے۔ ریاستی ضلع کو ادھم پور سیٹ سے الگ کرکے جموں حلقہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح شوپیان، جو جنوبی کشمیر کے بالکل وسط میں ہے، کو سرینگر کی سیٹ کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اس کی سرینگر حلقہ کے ساتھ بارڈر ہی نہیں ملتا۔ اننت ناگ کو راجوری۔ پونچھ سے ملانے کا واحد ذریعہ شوپیان کے راستے مغل روڈ ہے۔ یہ راستہ سردیوں میں بند رہتا ہے۔ کسی بھی امیدوار کو اسی انتخابی حلقہ کے پیر پنجال کے دوسری طرف کے علاقوں کی طرف مہم کے لیے جانا ہو تو پہلے ڈوڈہ، پھر ادھمپور اور پھر جموں یعنی تین اضلاع کو عبور کرکے اپنے حلقہ کے دوسری طرف پہنچ سکتا ہے۔

جنوبی کشمیر ایک واحد ایسا خطہ ہے، جو خالصتاً کشمیری نژاد نسل پر مشتمل تھا۔ ورنہ چاہے وسطی کشمیر ہو یا شمالی کشمیر، اس میں دیگر نسل کے افراد بھی آباد ہیں۔ اب پونچھ، راجوری کو شامل کرکے اس میں گوجر اور پہاڑی آبادی کو شامل کیا گیا ہے، تاکہ کشمیری آبادی کے اثر و رسوخ پر لگام لگائی جائے۔ اعداد و شمار کے مطابق اب اس حلقہ کی کل ۲۶ لاکھ ۳۱ ہزار کی آبادی میں ۱۴ر لاکھ ۸۰ ہزار کشمیری یعنی ۵۶٫۲۵ فیصد، گوجر و بکروال ۱۹٫۸۱ر فیصد، پہاڑی ۱۹٫۸۴ر فیصد، ڈوگرہ ۰٫۴۷ فیصد اور پنجابی ۰٫۴۹ فیصد ہوں گے۔ بی جے پی کو یقین ہے کہ حال ہی میں پہاڑی آبادی کو شیڈول ٹرائب (ST) کی فہرست میں شامل کرنے سے یہ آبادی یکمشت اس کے امیدوار کو ووٹ کرے گی۔ پہلے یہ سہولیت صرف گوجر بکروال کمیونٹی کو ہی مہیا تھی، جو پسماندہ قوم تصور کی جاتی تھی۔ اس سہولت کی وجہ سے پہاڑی کمیونٹی، جو جموں و کشمیر کی آبادی کا سات فیصد یعنی کل ۹٫۷ لاکھ ہیں، کے لیے اسمبلی، ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں نشستیں مخصوص ہوں گی۔ مگر اس کی وجہ سے گوجر بکروال کمیونٹی ناراض ہے، کیونکہ ابھی تک وہ اکیلے ہی ان نشستوں کی دعویدار تھی۔ خیر سیاسی مبصرین بھی خبردار کر رہے ہیں کہ ایک لمبے عرصے تک کسی خطے کو سیاسی عمل سے دور رکھنا، خطرناک عوامل کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کشمیر میں سبھی روایتی سیاسی قوتوں کی ایک طرح سے زبان بندی کرکے ان کو بے وزن کر دیا گیا ہے۔ کشمیر میں واقعی ایک امن ہے، مگر یہ قبرستان کی خاموشی ہے۔ اگر اطمینان کی خاموشی درکار ہے تو اس کے لیے سیاسی عمل کے ساتھ سیاسی زمین بھی واپس دینی ہوگی اور مسئلہ کے دیرپا حل کے لیے کوششیں بھی کرنا پڑیں گی۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۳ر مارچ ۲۰۲۴ء)

آخر جنوبی افریقا ہی کیوں!

ضرار کھوڑو

جنوبی افریقا ہی کیوں؟ دنیا کے ۱۹۵ ممالک میں سے صرف جنوبی افریقا ہی کیوں ہے جو مظلوم فلسطینیوں کی نسل کشی کرنے پر اسرائیل کو عالمی عدالت میں لے کر گیا ہے؟

مسلم اور عرب ممالک کے برعکس جنوبی افریقا کی فلسطین کے ساتھ کوئی اخلاقی، ثقافتی یا مذہبی وابستگی نہیں ہے۔ وہ عرب ممالک کے مقابلے میں فلسطین سے تقریباً ۷ ہزار کلومیٹر دور واقع ہے۔ تو پھر جنوبی افریقا نے ہی کیوں صہیونی ریاست کے خلاف آواز اٹھائی حالانکہ دیگر ممالک جو کہ فلسطین سے ہر لحاظ سے زیادہ قریب ہیں، ان کے قتلِ عام پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں؟

اس کا جواب ہمیں تاریخ سے ملتا ہے کیونکہ فلسطین کی طرح جنوبی افریقی باشندے بھی سفید فام آبادکاروں کے ظلم کا شکار ہو چکے ہیں جو کہ اپنے خونی جبر اور نسل پرستی پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسرائیل ۱۹۴۸ء میں بنا، اسی سال ہی جنوبی افریقا میں نسل پرست نوآبادیاتی دور نے اپنے قدم جمائے۔

اس اتفاق سے قطع نظر دونوں ریاستوں کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ مقامی آبادی کی قیمت پر ان کی سفید فام آبادکاروں کی نوآبادی کی حیثیت ان میں ایک تعلق پیدا کرتی ہے۔ یوں ان دونوں ریاستوں کے ناپاک اتحاد کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۳ء میں تب ہوا جب جنوبی افریقا کے وزیراعظم ڈینیئل ملان نے اسرائیل کا سرکاری دورہ کیا۔ یوں ان دونوں آبادکار حکومتوں کے درمیان ایک قریبی اتحاد کی ابتدا ہوئی۔

آنے والے برسوں میں ان دونوں آبادکار قوتوں کا اتحاد مضبوط ہوتا گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے سیکھا اور اپنے اپنے زیرِ قبضہ ریاستوں میں مظلوم عوام کو دبا کر رکھنے میں ایک دوسرے کی حمایت بھی کی۔ فلسطینی آبادی کا بھی مرکز سے تعلق منقطع کر دیا گیا بالکل اسی طرح جس طرح جنوبی افریقا میں سیاہ فام آبادی کے لیے 'بنتو ستان' بنائے گئے تاکہ انہیں ملک کے سیاسی نظام سے دور رکھا جاسکے۔

دونوں ریاستوں کے درمیان مماثلت کو حکومتی سطح پر بھی مانا گیا جیسے جنوبی افریقا کے وزیراعظم ہینڈرک ویرورڈ جو بنتوستان پروجیکٹ کے معمار کے طور پر جانے جاتے ہیں، نے خود کہا 'یہودیوں نے عربوں کے ہاتھ سے اسرائیل لے لیا حالانکہ وہ اس زمین پر ہزاروں برسوں سے رہ رہے تھے۔

جنوبی افریقا کی طرح اسرائیل بھی ایک نسل پرست ریاست ہے' اور جہاں اسرائیل بین الاقوامی فورمز پر نسل پرستی کی مذمت کرتا تھا، حقیقت یہ تھی کہ وہ جنوبی افریقا کو اپنا قریبی سمجھنے لگا جبکہ اسرائیل کے جنرل رافائل ایتان نے جنوبی افریقی سیاہ فاموں کے بارے میں کہا کہ 'وہ سفید فام اقلیت پر قابض ہونا چاہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے عرب ہمیں اپنے زیرِ کنٹرول لانا چاہتے ہیں۔ ہم جنوبی افریقا میں موجود سفید فام اقلیت کی طرح ہیں اور ہمیں ان لوگوں کو روکنا ہے جو ہمیں اپنے قابو میں کرنا چاہتے ہیں'۔

ان دونوں زیرِ تسلط آبادیوں کو اپنے قابو میں رکھنا دونوں آبادکار حکومتوں نے اپنی ترجیح بنالیا۔ اسی مقصد کے تحت اسرائیل نے جنوبی افریقی سفید فاموں کو مظاہرین کو کنٹرول کرنے والی گاڑیاں اور ہتھیار فراہم کیے اور ان کی افواج کو تربیت دی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سیکڑوں اسرائیلی فوجی مشیر جنوبی افریقا میں تعینات کیے جبکہ جنوبی افریقا کے فوجی اسرائیل میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔

اسرائیل نے جوہری پروگرام میں بھی اپنے نظریاتی ساتھیوں کی مدد کی۔ ان کی مدد سے جنوبی افریقا نے ۶ جوہری بم تیار کیے لیکن ان تمام بموں کو اس وقت تلف کر دیا گیا جب جنوبی افریقا کے صدر ایف ڈبلیو ڈی کلرک نے اپنے ملک کی عالمی ساکھ کو بحال کرنے کی کوشش میں جوہری پروگرام کو ترک کر دیا تھا۔

ساکھ کی بات کی جائے تو اسرائیل نے اپنے اتحادی کو عالمی دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لیے اکثر مداخلت کی، پھر چاہے وہ ۱۹۷۵ء میں 'پروپیگنڈا اور نفسیاتی جنگ' کے لیے 'جوائنٹ سیکریٹریٹ فار پولیٹیکل اینڈ سائکالوجیکل وارفیئر' کا قیام ہی کیوں نہ ہو جو جنوبی افریقا کی عالمی ساکھ کو بحال رکھنے کے لیے مالی امداد کے ساتھ ہونے والی دوطرفہ مہم کا حصہ تھا۔

لیکن ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے، جہاں ایک جانب اسرائیل اور نسل پرست جنوبی افریقی حکومت ایک دوسرے کا ساتھ دے رہی تھیں وہیں دوسری جانب فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او)، نیلسن منڈیلا کی افریقی نیشنل کانگریس سے اپنے تعلقات استوار کر رہی تھی۔

جس وقت سفید فام برتری پر یقین رکھنے والے جنوبی افریقا کے وزیراعظم نے اسرائیل کا دورہ کیا وہیں جنوبی افریقا کے رہنماؤں میں سے ایک نیلسن منڈیلا نے ۱۹۹۰ء میں جیل سے اپنی رہائی کے بعد یاسر عرفات سے ملاقات کی جنہوں نے اوسلو معاہدے سے قبل منڈیلا سے اس معاملے پر مشورہ طلب کیا۔ نیلسن منڈیلا بذاتِ خود قضیہِ فلسطین کے بہت بڑے حمایتی تھے جن کا اس حوالے سے مذکورہ قول بھی کافی مقبول ہے 'ہماری آزادی، فلسطین کی آزادی کے بغیر نامکمل ہے'۔

یہ صرف کوئی نعرہ نہیں تھا بلکہ اپنی پوری زندگی میں نیلسن منڈیلا نے اخلاقی اور مادی بنیادوں پر ان کی حمایت کی بات کی بالکل اسی طرح، جس طرح پی ایل او اور فلسطینیوں نے ہر موقع پر سیاہ فام جنوبی افریقی لوگوں کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا۔

نتیجتاً جب بات نیلسن منڈیلا اور افریقی نیشنل کانگریس کو پسپا کرنے کی آئی تو اسرائیلی لابی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسرائیل کی حمایت یافتہ اینٹی ڈیفیمیشن لیگ نے افریقی نیشنل کانگریس کو 'جابر، انسانیت مخالف، جمہوریت مخالف، اسرائیل مخالف اور امریکا مخالف' قرار دے کر اس کی مذمت کی۔

اسرائیل کے سب سے بڑے حمایتی امریکا نے بھی اس معاملے میں مکروہ کردار ادا کیا۔ شواہد سے ثابت ہوا کہ سی آئی اے نے نیلسن منڈیلا کی نقل و حرکت پر نظر رکھی اور معلومات جنوبی افریقا کی نوآبادیاتی حکومت تک پہنچائی جس کے نتیجے میں انہیں گرفتاری کے بعد ۲۷ سال قید میں گزارنے پڑے۔ نیلسن منڈیلا ۲۰۰۸ء تک امریکا کے مطلوب دہشتگردوں کی فہرست میں شامل تھے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ جنوبی افریقی قوم جس نے تسلط اور ناانصافی کا سامنا کیا اب وہ اپنے فلسطینی بہن بھائیوں کو قاتل اور قابض قوت کے شکنجے سے آزاد کروانا چاہتے ہیں۔

"Southern promises".
(Daily "Dawn" Karachi. January 15, 2024)

سیرتؐ کے موضوع پر مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

سُوئی یوکرین پر اٹکی ہے!

ابو صباحت

جنگ ہو یا امن، ہر معاملے میں سازش کا نظریہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے یا پھر محسوس ہوتا ہے۔ ایک عام تصور یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی جو کچھ ہو رہا ہے، وہ حالات کی پیداوار ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ حالات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے مگر اس نکتے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جن کے ہاتھ میں تمام معاملات ہوتے ہیں، وہ حالات کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتے ہیں یا پھر اپنی مرضی کے حالات پیدا کر کے دنیا کو اُس طرف لے جاتے ہیں جس طرف لے جانا مقصود ہوتا ہے۔

چار سال قبل کورونا وائرس کی وبا پھیلی تو دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ کیا ترقی یافتہ اور کیا پسماندہ، تمام ہی ملک اِس کے نشانے پر آئے۔ ترقی یافتہ دنیا کو جانی نقصان کے حوالے سے زیادہ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پسماندہ ممالک میں جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا مگر ہاں، معیشتیں ڈھلک گئیں۔ تمام معاشی معاملات میں گراوٹ اس قدر واقع ہوئی کہ لاکھ کوشش کے باوجود نصف سے زیادہ پسماندہ ممالک اب تک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں۔

دو سال قبل یوکرین پر روس کی لشکر کشی کے نتیجے میں جو جنگ شروع ہوئی، وہ اب تک جاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی کئی سال جاری رہے گی۔ اس جنگ کے جاری رہنے کا امکان زیادہ تو انا اس لیے ہے کہ مغربی طاقتیں اس جنگ کو روکنے میں بظاہر زیادہ دلچسپی نہیں لے رہیں جبکہ یہ اُن کے لیے بھی ''مارو یا مر جاؤ'' والا معاملہ ہے۔ امریکا اور یورپ کی ساکھ داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یوکرین کو ڈھنگ سے روس کا سامنا کرنے کے لیے بہت کچھ درکار ہے۔ اِدھر امریکا اور یورپ میں یوکرین جنگ کے حوالے سے اختلافِ رائے شدت اختیار کر چکا ہے۔ امریکا میں یہ معاملہ زیادہ پریشان کن نہیں، یورپ میں واضح تقسیم دکھائی دے رہی ہے۔

یوکرین کی فوجی قوت غیر معمولی تھی مگر اب نہیں رہی۔ روس اُس سے کئی گنا طاقتور تھا اور ہے۔ اور پھر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ یہ لڑائی روس اور یوکرین کے درمیان نہیں بلکہ دو گروہوں کے درمیان ہے۔ روس کی پشت پر چین، شمالی کوریا اور چند دوسرے ممالک کھڑے ہیں جو مغربی دنیا کے مخالف ہیں۔ اِدھر یورپ اور امریکا مل کر یوکرین کے محاذ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ گویا دو بلاک آمنے سامنے ہیں۔

یوکرین اس وقت روس کے خلاف امریکا اور یورپ کے لیے ''فائر وال'' کا کردار ادا کر رہا ہے۔ جس طرح کسی کمپیوٹر سسٹم کو وائرس یا ہیکنگ سے بچانے کے لیے اینٹی وائرس سوفٹ ویئر استعمال کیا جاتا ہے، بالکل اُسی طرح امریکا اور یورپ بھی یوکرین کو اینٹی وائرس کے درجے میں برت رہے ہیں۔ اگر روس نے یوکرین کو مکمل طور پر پچھاڑ دیا تو اُس کے لیے مشرقی یورپ کی سمت مزید بڑھنا آسان ہو جائے گا۔ امریکا اور یورپ اُسی دن سے ڈرتے ہیں جب یوکرین کو شکست ہو اور روس کے لیے اگلا مورچہ آسان ہو جائے۔

کم و بیش پچاس سال کے بعد روس ایک بار پھر تیزی سے ابھر رہا ہے اور دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ ایک بار پھر سپر پاور میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ روس کی طرح چین بھی اشتراکیت کا علم بردار ہے۔ اِن دونوں کے ساتھ شمالی کوریا بھی کھڑا ہے جو اگرچہ بہت طاقتور تو نہیں مگر پھر بھی اُس کا وجود مغرب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ مغربی دنیا کو یہ خدشہ بھی لاحق ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایشیا و افریقا کے بیشتر ممالک (بشمول مسلم دنیا) چین اور روس کے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ جنوب مشرقی اور جنوبی ایشیا کے بیشتر ممالک کا چین کی طرف جھکاؤ ہے جبکہ وسطِ ایشیا کے بیشتر ممالک روس کی طرف واضح جھکاؤ رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ فطری ہے کیونکہ جنوبی امریکا میں بھی تو امریکا اور یورپ کی طرف واضح جھکاؤ پایا جاتا ہے۔

معیشتی اور مالیاتی امور کے ماہرین بارہا کہہ چکے ہیں کہ بیسویں صدی امریکا اور یورپ کی تھی، اکیسویں صدی یا تو چین کی ہے یا پھر کسی کی بھی نہیں۔

یوکرین جنگ کے حوالے سے امریکا ہچکچاہٹ کا شکار ہے تو یورپ بھی دامن سمیٹ کر بیٹھا ہے۔ یوکرین کے محاذ پر یورپ کی شکست روسی عزائم کی راہ میں کھڑی ہوئی رکاوٹیں گرا دے گی۔ اس کے نتیجے میں ایسا بہت کچھ ہو سکتا ہے جس کا ابھی تک دنیا نے تصور بھی نہیں کیا۔ مسلم دنیا کا فیصلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر مشرقِ وسطیٰ نے یورپ اور امریکا کو ثانوی حیثیت دے کر چین اور روس کو اپنا لیا تو ہم ایک ایسی دنیا دیکھیں گے جس میں مغرب محض علم و فن اور ثقافت کے محاذ پر طاقتور رہ جائے گا۔ اور پھر یہ طاقت بھی رفتہ رفتہ گھٹتی چلی جائے گی۔ معیشت اور عسکری قوت کے محاذ پر کامیاب رہنے والے آگے چل کر علم و فن کے محاذ پر بھی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ یورپ ایسا کر کے دکھا چکا ہے۔ امریکا کا بھی کچھ کچھ ایسا ہی معاملہ رہا ہے۔

یوکرین کی جنگ طُول پکڑ گئی تو بہت کچھ تبدیل ہوگا۔ یوکرین کو زیادہ سے زیادہ عسکری قوت کی ضرورت ہے۔ روس کو پیچھے دھکیلنے کے لیے یوکرین کو جتنے وسائل درکار ہیں، وہ سب کے سب یورپ یا امریکا سے نہیں مل سکتے۔ ایک سبب تو اس کا یہ ہے کہ یورپ کسی بڑی جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔ امریکا نے اُسے دنیا بھر کے مناقشوں میں گھسیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یورپی طاقتیں اپنی اپنی حدود میں رہنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ علم و فن کے محاذ پر وہ طاقتور ہیں اور اِسی محاذ پر طاقتور رہنا چاہتی ہیں۔ امریکا نے یورپ کو افغانستان اور مشرقِ وسطیٰ کے بحرانوں میں گھسیٹنے کی بہت کوشش کی ہے مگر وہ ایک حد تک ہی بڑھا ہے۔ امریکی پالیسیوں کا یورپ کی پالیسیوں سے تال میل بھی تو نہیں بن پا رہا۔

امریکا واحد سپر پاور ہے مگر یہ منصب بھی اب علامتی نوعیت کا رہ گیا ہے۔ چین نے معیشت میں تو اپنے آپ کو منوا ہی لیا تھا، اب عسکری قوت کے حوالے سے بھی وہ انتہائی طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ خلائی ٹیکنالوجی میں بھی چین کی مہارت سے دنیا واقف ہے۔ امریکا اور یورپ کے لیے چین کی طاقت تو پریشان کن ہے ہی، اضافی پریشانی یہ ہے کہ روس نہ صرف تیزی سے ابھر رہا ہے بلکہ چین کا ہم خیال بھی ہے۔ اگر روس اور چین نے مل کر ایشیا کو باقی دنیا پر متصرف کرنے کی ٹھان لی تو کیا ہوگا؟

یوکرین کی جنگ اُس موڑ پر ہے جہاں رونما ہونے والی کوئی بھی بڑی بات پوری دنیا کو بدل کر رکھ دے گی۔ یوکرین تنہا روس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لازم ہے کہ یورپ اُس کی پشت پر کھڑا ہو۔ امریکا کا ساتھ بھی ناگزیر ہے مگر یورپ پہلے نمبر پر ہے کیونکہ یوکرین کی شکست کی صورت میں یورپ کا بھی بہت کچھ داؤ پر لگ سکتا ہے۔ افریقا کی حقیقت سب جانتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ یورپ سے سَٹا ہوا ہے اور دوسری طرف اُس کا جھکاؤ چین کی طرف ہو رہا ہے۔ چین نے افریقا میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ چین کی سرمایہ کاری تو خیر یورپ اور امریکا میں بھی اچھی خاصی ہے۔ چین نے اب تک دنیا بھر میں صرف معاشی معاملات کو ترجیح دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ کئی

شعبوں میں اُس کی واضح برتری دکھائی دینے لگی ہے۔ یہ سب کچھ ویسے تو خیر پورے مغرب کے لیے انتہائی پریشان کن ہے تاہم یورپ کو زیادہ اختلاج کا سامنا ہے۔ وہ معاشی معاملات میں چین سے پریشان تھا، اب عسکری سطح پر روس سے بھی خوفزدہ ہے۔ روس نے واضح کر دیا ہے کہ وہ اب کسی کے روکے سے رُکنے والا نہیں۔

امریکا میں بھی پالیسیاں تبدیل ہو رہی ہیں اور یورپ میں بھی۔ سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ''سب سے پہلے امریکا'' کی پالیسی اپنائی یعنی بیرونِ ملک مہم جُوئی ترک کر کے اپنے گھر کو ٹھیک کرنے کی ٹھانی۔ امریکیوں کے لیے یہ امر بھی اچھا خاصا پریشان کن ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ بہت حد تک روس نواز ہیں۔ صدارتی انتخاب میں اُن کی کامیابی کو روسی ہیکرز کی طرف سے کی جانے والی کارستانیوں کا نتیجہ بھی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ دوبارہ صدر منتخب ہو گئے تو یوکرین کے لیے امریکا کی امداد مکمل طور پر بند ہو سکتی ہے۔ یوں یوکرین میں جنگ جاری رکھنے کی پوری ذمہ داری یورپ کے ناتواں کاندھوں پر آن پڑے گی۔ ایسا ہوا تو یورپ میں مزید اندرونی اکھاڑ پچھاڑ واقع ہوگی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر یورپی قوتوں میں یوکرین جنگ کے حوالے سے سیاسی سطح پر غیر معمولی اندرونی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور پھر بین الریاستی اختلافات بھی تو ہیں۔

کورونا وائرس کے نتیجے میں جو معیشتی بگاڑ پیدا ہوا تھا، اُس سے نپٹنے کی کوششوں میں تمام معیشتوں کو یکساں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ امریکا اور یورپ کے لیے اب دوسرے خطوں میں بگاڑ پیدا کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنے کی حکمتِ عملی زیادہ کارگر نہیں رہی۔ ایسے میں ناگزیر ہے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پر گامزن ہوں اور اپنی معیشتی و علمی برتری برقرار رکھنے کے لیے ایسی پالیسیاں اپنائیں جو اپنے لیے تو تعمیری نوعیت کی ہوں تاہم کسی اور کے لیے لازمی طور پر تخریبی نوعیت کی ثابت نہ ہوں۔ ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ امریکا اور یورپ ایسا کر سکیں گے یا نہیں کیونکہ اب تک وہ دوسروں کو پریشان کر کے اپنے لیے راحت کا سامان کرتے آئے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی شہر کو ناکام بنانے کے لیے دیگر شہر مل کر وہاں چند شر پسند گروہوں کو پالیں تاکہ وہاں امن قائم نہ رہے اور سرمایہ کاری ہو سکے نہ کاروبار۔ امریکا اور یورپ نے اب تک دوسروں کی قبور پر اپنا محل تعمیر کرنے کی راہ چُنی ہے۔ اب لازم ہو گیا ہے کہ وہ اس راہ پر چلنا ترک کریں اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ ایسا کریں جس سے دنیا میں بہتری کی راہ ہموار ہو۔

یہ سب کچھ ایسا آسان نہیں کہ سوچے اور ہو جائے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جس میں تمام معاملات آپس میں جُڑے ہوئے ہیں۔ اب کوئی بھی ملک جزیرہ نہیں رہا۔ سبھی ایک وسیع سمندر کا حصہ ہیں۔ ٹیکنالوجی نے تمام معاملات کو آپس میں اس طور جوڑ دیا ہے کہ اب کہیں بھی تھوڑا سا بگاڑ پیدا ہو تو بہت کچھ بگڑ جاتا ہے۔ ایسے میں پالیسیاں سوچ سمجھ کر بنائی جانی چاہئیں۔

یوکرین جنگ کے نتیجے سے بہت کچھ جُڑا ہوا ہے۔ یوکرین پر روس کی لشکر کشی مین لینڈ یورپ یا مغربی یورپ کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اگر یوکرین نے ہار مان لی تو خطرے کی گھنٹی کو گھنٹے میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ روس پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ وہ پیچھے کیوں ہٹے گا جبکہ اُس کے پاس اچھی خاصی طاقت موجود ہے۔ یوکرین کے لیے آگے بڑھنا تو ممکن تھا ہی نہیں، اب پیچھے نہ ہٹنا بھی ممکن نہیں رہا۔ کئی محاذوں پر اُسے شدید نوعیت کی پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یورپ کی بعض طاقتیں اب بھی اُس کے ساتھ ہیں اور اِن ریاستوں کے سربراہان یوکرین کے دارالحکومت کا دورہ کر کے بھرپور اظہارِ یکجہتی بھی کرتے رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یوکرین کے لیے جنگ جاری رکھنا انتہائی دشوار ہو چکا ہے۔ اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے یورپ اور امریکا کو مل کر جتنے وسائل فراہم کرنا ہیں، وہ آسانی سے فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ ایسا کرنا اب اس لیے ممکن نہیں رہا کہ معیشتی کمزوریوں نے تمام ہی ریاستوں کو جکڑ رکھا ہے۔ امریکا اور یورپ کی معیشتیں چین کے ہاتھوں انتہائی نوعیت کے بگاڑ سے دوچار ہیں۔ ہائی ٹیک میں مغربی دنیا کی واضح برتری نے غیر معمولی معیشتی استحکام کی راہ ہموار کی تھی۔ اب چین ہائی ٹیک میں بھی اس طور قدم رکھ چکا ہے کہ اُس کی مصنوعات امریکا اور یورپ کی منڈیوں پر چھا چکی ہیں۔ ایشیا اور افریقا کی منڈیاں تو پہلے ہی اُس کی مٹھی اور جیب تھیں۔ امریکا اور یورپ کی منڈیوں پر ممکن بنائی جانے والی برتری نے چین کے حوصلے مزید بلند کیے ہیں اور یہ بات روس کے لیے بھی طمانیت کا سامان کرتی ہے۔

یوکرین کی جنگ کے فیصلے پر بہت سے فیصلوں کی سُوئی اٹکی ہوئی ہے۔ اگر روس نے یہ معرکہ واضح طور پر سر کر لیا تو امریکا اور یورپ کے سامنے ایک واضح اور کم نقصان والا راستہ یہ رہ جائے گا کہ روس سے وسیع البنیاد مذاکرات کریں اور عالمی سطح پر طاقت کے توازن کے حوالے سے معقول رویہ اختیار کریں۔ امریکا اگر پوری دنیا کو تنِ تنہا چلانے کی ضد ترک کرے تو معاملات کی بہتری کی راہ ہموار ہو سکتی ہے مگر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ امریکی قیادت اب تک زمینی حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے بجائے اُنہیں تبدیل کرنے پر زیادہ متوجہ رہی ہے۔ ایسے میں یورپ کے لیے بھی کوئی واضح فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔ یوکرین کی شکست اُسے زیادہ ہدف پذیر بنائے گی اور امریکا نے یورپ کی پُشت پناہی میں تذبذب کا مظاہرہ کیا یا کنجوسی کا ارتکاب کیا تو روس اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر پوری یورپ کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بڑی جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ ایسی کسی بھی جنگ میں پوری دنیا اُلٹ، پلٹ سکتی ہے۔

یوکرین جنگ کو کسی بڑی جنگ میں تبدیل ہونے سے روکنے کی ایک واضح صورت یہ ہو سکتی ہے کہ امریکا اور یورپ مل کر روس سے مذاکرات کی راہ ہموار کریں۔ اُنہیں یہ خدشہ لاحق ہے کہ روس سے مذاکرات پر آمادہ ہونے کو باقی دنیا اُن کی کمزوری سے تعبیر کرے گی۔ یہ خدشہ پورا غلط بھی نہیں۔ روس سے مذاکرات پر آمادہ ہونے کو امریکا اور یورپ کی کمزوری ہی سے تعبیر کیا جائے گا تاہم اُن دونوں کے پاس اس سے زیادہ باعزت راستہ کوئی ہے بھی نہیں۔

یورپ کی بہت سی طاقتوں میں روس کا سامنا کرنے کے لیے یوکرین کو زیادہ مضبوط بنانے سے متعلق تحفظات اور اختلافات پائے جا رہے ہیں۔ اندرونی اختلافات نے فیصلہ سازی کی قوت کو متاثر کیا ہے۔ یورپ میں انتہائی دائیں بازو کی سیاست تیزی سے ابھر رہی ہے۔ شدید قوم پرستی کی لہر سی آئی ہوئی ہے۔ الٹرا نیشنلسٹ لیڈر گھر کو درست رکھنے پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ لبرل سیاست پسپائی اختیار کر رہی ہے۔ الٹرا نیشنلسٹ چاہتے ہیں کہ امریکا کی باتوں میں آ کر دنیا بھر میں عسکری مہم جُوئی نہ کی جائے اور اس کام میں اُس کا ساتھ بھی نہ دیا جائے۔

چین کے ہاتھوں معیشت کے محاذ پر انتہائی نوعیت کی مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور امریکا اور یورپ کے پاس اب مفاہمت کی راہ پر گامزن ہونے کے سوا چارہ نہیں۔ یہ راہ اب ان کے لیے اجنبی سی ہو چکی ہے مگر اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ سب کو گھوم پھر کر اِسی راہ پر آنا پڑتا ہے۔ یوکرین جنگ نے روس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان کی راہ ہموار کی ہے مگر پھر بھی روسی قیادت خود کو منوانے کی راہ پر گامزن ہے اور اُسے طاقت سے روکنے کی کوئی معقول صورت اب تک دکھائی نہیں دے رہی۔ ایسے میں بہتر یہ ہے کہ مفاہمت اور سفارت کاری سے کام لیا جائے۔ یوکرین جنگ کا دائرہ یونہی وسعت اختیار کرتا رہا تو یورپ لپیٹ میں آتا جائے گا اور یوں ایک اور جنگِ عظیم زیادہ سے زیادہ ممکن ہوتی چلی جائے گی۔

●●●

روس کے جاسوسوں کی واپسی

عشروں تک سابق سوویت یونین کے جاسوسوں نے مغربی دنیا کا ناک میں دم کیا۔ سابق سوویت یونین نے سرد جنگ کے زمانے میں خفیہ نیٹ ورکس کو غیر معمولی حد تک فعال رکھا۔ اس کے نتیجے میں وہ یورپ اور امریکا میں اپنے قدم جما کر قومی مفادات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے۔

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد روس نے خفیہ نیٹ ورک کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔ امریکا اور یورپ سے مخاصمت کے باعث روس کے لیے خفیہ نیٹ ورک کو مستحکم رکھنا لازم تھا۔ اب روس نے اس معاملے کو زیادہ طول دے دیا ہے۔ یوکرین جنگ کے باعث روس کا جاسوسی نظام زیادہ وسیع پیمانے پر کام کر رہا ہے۔ ایسے میں مغرب کے لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ روسی خفیہ اداروں کو اہم نیٹ ورکس میں نقاب لگانے سے روکنے کے لیے مستعد رہیں۔

حریف ممالک کے خفیہ اداروں کے سربراہ بالعموم ایک دوسرے پر کھل کر تنقید نہیں کرتے، کیچڑ نہیں اچھالتے مگر گزشتہ ماہ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے سربراہ بل برنز اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ یوکرین جنگ اُن کے ادارے کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ان کے ریمارکس نے روس کی ''خفیہ سروسز'' میں کسی نہ کسی حد تک تو اثرات مرتب کیے ہی ہوں گے۔

کچھ مدت سے روس کے خفیہ نیٹ ورکس کو یورپ میں مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ بہت سے روسی جاسوسوں یا ایجنٹوں کو یورپ سے نکال باہر کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں روس کا خفیہ اداروں کا نظام قابلِ ذکر حد تک متاثر ہوا۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ روس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، ہمت ہار دی ہے۔ وہ اب بھی اپنے خفیہ نظام کو زیادہ سے زیادہ مستعد رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے اور اس میں اُسے بہت حد تک کامیابی ملی ہے۔

لندن کے تھنک ٹینک دی رائل یونائیٹڈ سروسز انسٹیٹیوٹ (RUSI) کو شواہد ملے ہیں کہ روسی جاسوسوں نے اپنی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، اپنی مہارت کا معیار بلند کیا ہے اور مغرب کے خلاف انہوں نے سیاسی جنگ کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا ہے۔

چند حالیہ سال روسی جاسوسوں کے لیے انتہائی پریشان کن رہے ہیں۔ ۲۰۲۰ء میں روس کی سکیورٹی سروس ایف ایس بی نے صدر ولادیمیر پوٹن کے کٹر حریف الیگزی ناوالنی کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی۔ یہ کام اس لیے کیا گیا کہ الیگزی نے اُن کا تمسخر اڑایا تھا۔

روس نے یوکرین پر حملے کا منصوبہ بہت پہلے بنالیا تھا۔ روسی خفیہ ادارے اس منصوبے کو طشت از بام ہونے سے نہ روک سکے۔ مغربی خفیہ اداروں نے یوکرین پر روس کی لشکر کشی کا منصوبہ معلوم کرکے عام بھی کر دیا۔ اس کے نتیجے میں روس کے خفیہ اداروں کا مورال تھوڑا بہت تو گرا ہی ہوگا۔

روس کی بیرونی خفیہ ایجنسی ایس وی آر کے لیے یہ دھچکا کم نہ تھا کہ یورپ بھر میں روسی سفارت خانوں میں تعینات ۶۰۰/افراد کو جاسوسی کے الزام میں نکال دیا گیا۔ یہ بات بھی کسی بڑے صدمے سے کم نہ تھی کہ روسی خفیہ اداروں کے ۸/افسران بھی بے نقاب ہوئے جو سفارتی ڈھال استعمال کیے بغیر غیر روسی کے طور پر کام کر رہے تھے۔

جیک واٹلنگ، نک رینالڈز اور یوکرین کے وزیر دفاع اور فارن انٹیلی جنس چیف کے مشیر اولیک سینڈر ڈینیلک نے RUSI کے لیے جو رپورٹ لکھی ہے، اس میں روسی اسپیشل سروسز سے حاصل کردہ دستاویز کا حوالہ دیا گیا ہے اور یوکرین سمیت یورپ کے متعلقہ (ممکنہ طور پر جاسوسی کے) اداروں کے افسران کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ ۲۰۲۲ء کے اواخر میں روس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے خفیہ اداروں کی طرف سے زیادہ دیانت دارانہ رپورٹنگ کی ضرورت ہے۔ اس نے کریملن کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف سرگئی کرینکو کو کمیٹیز آف اسپیشل انفلوئنس کا انچارج مقرر کیا۔ یہ کمیٹیاں مغربی ممالک کے خلاف آپریشنز میں رابطہ کاری کرتی ہیں اور اُن کا تجزیہ بھی۔

عملے کی اس تبدیلی سے محسوس ہوتا ہے کہ پروپیگنڈا اہم کے محاذ پر کچھ بہتری آئی ہے۔ مثلاً مالدووا میں وہاں کی حکومت کی طرف سے یورپی یونین کی رکنیت کے حصول کی کوشش کے خلاف روسی کوششیں بے ترتیب بھی تھیں اور بے اثر بھی۔ عملے کی تبدیلی سے یہ کوششیں جاندار ہوتی گئیں۔ روسی جاسوسوں نے مالدووا کی طرف سے یورپی یونین کی رکنیت کے حصول کی کوششوں کو وہاں کی صدر سے جوڑ دیا اور معاشی بحران کے لیے انہیں ذمہ دار قرار دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یوکرین کے لیے یورپی ممالک کی حمایت و امداد گھٹانے سے متعلق کوششیں بھی کامیاب ہوتی گئیں۔ جنوری میں جرمن ماہرین نے ایک ایسا نیٹ ورک پکڑا جس کے تحت سوشل میڈیا پلیٹ فارم 'ایکس' سے جرمن زبان میں ۵۰ ہزار اکاؤنٹس سے روزانہ لاکھوں پوسٹیں اَپ لوڈ کیے جانے کا انکشاف ہوا۔ ۱۲/فروری کو فرانس نے ایسی روسی ویب سائٹس کا نیٹ ورک بے نقاب کیا جو فرانس، جرمنی اور پولینڈ میں گمراہ کن باتیں پھیلا رہی تھیں۔

اس دوران روس کی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی GRU بھی اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی ہے۔ اُس نے طریقِ کار بھی بدلا ہے اور مہارت کا معیار بھی بلند کیا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس کے یونٹ نمبر ۲۹۱۵۵ نے، جس نے سابق افسر سرگئی اسکرپال کو سالزبری، برطانیہ میں قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی، اپنے عملے کے بہت سے ارکان، سرگرمیوں اور تنصیبات کو بیلنگکیٹ کے ہاتھوں بے نقاب ہوتے دیکھا ہے۔ بیلنگکیٹ تفتیشی گروپ ہے جو سرکاری معلومات اور لیک ہوجانے والی روسی ڈیٹا بیس کی مدد سے انکشافات کرتا ہے۔

روسی خفیہ ادارے GRU نے چھان بین کرنے پر پایا کہ اس کے عملے کے ارکان ڈیجیٹل معاملات میں بے دھیانی اور غفلت کے مرتکب ہو رہے ہیں کیونکہ وہ روسی انٹیلی جنس سے متعلق حساس مقامات پر اپنے سیل فون لے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی پایا کہ روسی انٹیلی جنس افسران کی ملک بدری سے یورپ اور دیگر خطوں میں اپنے جاسوسوں کو آپس میں جوڑے رکھنے میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ (شاید اسی لیے یوکرین جنگ کے حوالے سے سب کچھ ویسا نہیں ہوا جیسا سوچا گیا تھا۔) اس کے نتیجے میں ۲۰۲۰ء میں بہت بڑے پیمانے پر اصلاح کا عمل شروع ہوا۔ فروری ۲۰۲۲ء میں یوکرین جنگ شروع ہونے کے بعد یہ عمل تیز ہوگیا۔ چند ایک خرابیوں کے باوجود یونٹ ۲۹۱۵۵ کے سربراہ جنرل آندرے ایوریانوف کو GRU کے نائب سربراہ کے منصب پر ترقی دے کر نئی ''سروسز فار اسپیشل ایکٹیویٹیز'' بنائی گئی۔ یونٹ ۲۹۱۵۵ سے وابستہ افراد، جنہیں کبھی مسٹر اسکریپال کے لاچار قیدیوں الیگزینڈر مشکن اور اناطولی چیپیگا سے تشبیہ دی جاتی تھی، اب اپنے ذاتی اور دفتری سیل فون سرکاری تنصیبات پر ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ تربیت اب کسی باضابطہ سائٹ کے بجائے عام سے پرائیویٹ

مکانات میں دی جاتی ہے۔ پہلے بھرتی روسی اسپیشل فورسز Spetsnaz سے کی جاتی تھی۔ اب نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے فوج کا تجربہ لازم نہیں۔ اس کے نتیجے میں مغربی سکیورٹی سروسز کے لیے پرانی تصاویر اور لیک ہو جانے والی ڈیٹا بیس کی مدد سے انہیں شناخت کرنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے۔

روس نے اب سروس فار اسپیشل اکٹیویٹیز کی خصوصی شاخ (یونٹ نمبر ۵۴۶۵۴) قائم کی ہے۔ اس کا مقصد ایسی غیر قانونی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ہے جو دشمن خفیہ ایجنسیوں کی سخت جانچ پڑتال کے عمل سے بھی آسانی سے گزر جائیں۔ یہ یونٹ فرنٹ پر موجود کئی کمپنیوں کے ذریعے کنٹریکٹرز بھرتی کرتا ہے۔ ان کے نام اور کوائف حکومت کے ریکارڈ میں نہیں ہوتے۔ یہ یونٹ اپنے افسران کو دفاع سے متعلق وزارتوں، محکموں اور نجی کمپنیوں میں تعینات کرتا ہے۔ جی آر یو روسی جامعات میں پڑھنے والے بلقان، افریقا اور دیگر خطوں کے طلبہ کو ماہانہ یا سالانہ بنیاد پر وظائف دے کر ان سے کام لیتی ہے۔

ویگنر گروپ کے کیس سے بھی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ روسی خفیہ اداروں نے کس طور بربادی کو بھی اپنے لیے مواقع میں تبدیل کیا ہے۔ یہ گروپ دراصل کئی کمپنیوں پر مشتمل تھا جس کی سربراہی پراگوزن کے ہاتھ میں تھی۔ ویگنر بنیادی طور پر روسی اثر و رسوخ کے حامل ایک ونگ کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے ذریعے شام، لیبیا اور افریقا کے دیگر ممالک میں آمریت پر مبنی حکومتوں کو طاقت فراہم کی جاتی تھی۔ جون ۲۰۲۳ء میں پراگوزن نے، یوکرین جنگ میں وزیر دفاع اور آرمی چیف کی بدانتظامی پر احتجاج کے لیے، ماسکو کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ اس بغاوت کو بروقت کچل دیا گیا۔ دو ماہ بعد پراگوزن پرواز کے دوران طیارے کے پھٹ پڑنے سے ہلاک ہو گئے۔

روسی خفیہ اداروں نے پراگوزن کے جمع کردہ عسکری و مجرمانہ سرگرمیوں کے نیٹ ورک سے جڑے ہوئے لوگوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ ایف ایس بی نے داخلی امور سنبھالے اور ایس وی آر نے میڈیا ونگ سنبھال لیا۔ ۲۰۱۶ء میں امریکا کے صدارتی انتخابات پر یہ لوگ اثر انداز ہوئے۔ جی آر یو نے امور خارجہ سنبھال لیے۔ اس کے دو حصے کیے گئے۔ یوکرین کے لیے والنٹیئر کور بنائی گئی اور باقی دنیا کے لیے جنرل ایوریانوف کی قیادت میں ایکسپیڈیشنری کور تشکیل دی گئی۔ موخرالذکر نے گزشتہ برس کے اوائل تک ۲۰ ہزار بھرتیوں کی ڈیڈ لائن میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ ویسے اس کی طاقت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پراگوزن کے بیٹے نے، جو پراسرار طور پر زندہ ہے اور آزاد بھی، ویگنر گروپ کے فوجیوں کو روسی نیشنل گارڈ ''روزگوردیا'' کے ماتحت کرنے کی پیشکش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں نیشنل گارڈ اور جی آر یو کے درمیان مزید ٹھن گئی۔

روسی خفیہ اداروں کو مستحکم بنانے کی کوششوں کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ افریقا میں روسی خطرہ زیادہ توانا ہو گیا ہے۔ پراگوزن کی ہلاکت کے بعد جنرل ایوایانوف نے افریقا کے کئی ممالک کا دورہ کیا اور انہیں حکومت بچاؤ پیکیج کی پیشکش کی۔ اس پیکیج میں جی آر یو کی طرف سے مقامی اشرافیہ کے لیے طاقت کے ساتھ ساتھ مقامی حریفوں کے خلاف پروپیگنڈا بھی شامل ہے۔ اس کے بدلے میں روس چاہتا ہے کہ اسے معاشی رعایتیں دی جائیں۔ وہ لیتھیم کی کانوں اور سونے کی ریفائنریز تک رسائی چاہتا تھا۔ وہ نائجیریا سے فرانس کو بھی نکال باہر کرنے کی حکمتِ عملی کے ساتھ میدان میں آیا تھا۔

حال ہی میں چند ایک دھچکوں کے باوجود روس خفیہ ادارے ابھر رہے ہیں۔ رِگا میں واقع تفتیشی ویب سائٹ ''دی انسائیڈر'' نے یورپ بھر میں روس کے جاسوسی کے نیٹ ورکس سے متعلق کئی خبریں شائع کی ہیں۔ دی انسائیڈر نے بتایا ہے کہ کس طرح بلجیم کے دارالحکومت برسلز میں تعینات جی آر یو کا ایک افسر روسی اسلحہ ساز اداروں کو یورپی آلات فراہم کرتا ہے اور یہ کہ بنڈیسٹیگ سے تعلق رکھنے والا ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار اور یورپی پارلیمنٹ میں لِتھوانیا کا ایک رکن روسی ایجنٹ کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ موخرالذکر کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس نے کم و بیش دو عشروں تک روسی خفیہ اداروں کی خدمات انجام دیں۔

روسی خفیہ اداروں سے متعلق امور کے ماہر صحافی و تجزیہ کار آندرے سولداتوف کا کہنا ہے کہ روسی خفیہ اداروں کے لیے معاملات اُتنے برے نہیں رہے، جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اس کے خیال میں روسی خفیہ ادارے نہ صرف یہ کہ واپس آ چکے ہیں بلکہ دن بہ دن جدید تر ہوتے جا رہے ہیں اور صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔

روس کے صدر ولادیمیر پوٹن کسی زمانے میں سابق سوویت دور کی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے افسر تھے۔ وہ روس کے خفیہ اداروں کی کھوئی ہوئی عظمت بحال کرنا چاہتے ہیں۔

سولداتوف کہتے ہیں کہ اپریل ۲۰۲۳ء میں ایک روسی بزنس مین آرٹم یُس کو اطالوی شہر میلان میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر امریکی فوجی ٹیکنالوجی روس منتقل کرنے کا الزام تھا۔ سربیا سے تعلق رکھنے والے ایک کرائم گینگ نے آرٹم یُس کو اطالوی پولیس کے چنگل سے نکال کر روس پہنچایا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روس کا خفیہ نیٹ ورک کس حد تک مضبوط ہے۔

سولداتوف کا کہنا ہے کہ ماضی میں ایف ایس بی، ایس وی آر اور جی آر یو الگ الگ اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کرتے تھے۔ اب یہ تینوں خفیہ ادارے بہت حد تک مل کر کام کرتے ہیں اور یوکرین جنگ چھڑنے کے بعد روس سے نکل جانے والوں میں سے بھرتیاں کرتے ہیں۔ انفرادی حیثیت میں کسی کو کام پر لگانے سے اچھا ہے کہ گروہوں کی شکل میں رہنے والوں میں سے کسی کو ڈیوٹی سونپی جائے۔ اس صورت میں بے نقاب ہونے کا خطرہ کم رہتا ہے۔

روس نے سائبر اسپیس سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔ آئی ٹی کے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے روسی خفیہ اداروں نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا ہے۔ ''اسٹار بلیز رڈ'' نامی روسی ہیکر گروپ ایک مدت سے دنیا بھر کی حکومتوں کی ڈیٹا بیس کو نشانہ بناتا آیا ہے۔ امریکا اور برطانیہ نے بارہا عوام کو اس گروپ سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ مائیکروسوفٹ نے بتایا ہے کہ ایس وی آر سے وابستہ ایک گروپ ''کوزی بیئر'' نے کمپنی کے چند سینئر ایگزیکٹیوز کے ای میل اکاؤنٹس میں سیندھ لگائی ہے۔

یہ حملہ یوکرین کے پاور گرڈ پر جی آر یو کے سائبر اٹیک کے بعد کیا گیا۔ یوکرین کے پاور گرڈ کو نشانہ بنا کر میزائل حملے بھی کیے گئے ہیں۔ بلیک آؤٹ کی صورت میں حملے آسان ہو گئے۔

روس کے خفیہ اداروں کی تجدید کا مرحلہ مشرق و مغرب کے درمیان جاری مسابقت کے ایک اہم موڑ پر آیا ہے۔ ناروے کی انٹیلی جنس سروس نے ۱۲ فروری کو سالانہ رپورٹ جاری کی جس میں خبردار کیا گیا کہ یوکرین میں روس غیر معمولی حد تک برتری کا حامل ہے۔ ایک دن بعد ایسٹونیا نے بھی سالانہ انٹیلی جنس رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا کہ کریملن آئندہ عشرے میں روس اور معاہدہ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کے درمیان ایک بڑے مناقشے کا احتمال ہے۔

اس مناقشے کے حوالے سے روس کے جاسوسوں کو دیا جانے والا ٹاسک محض اتنا نہیں ہے کہ راز چرائے جائیں بلکہ نیٹو میں سیندھ بھی لگانی ہے، یوکرین کے لیے امریکا اور یورپ کی امداد کم بھی کروانی ہے اور دنیا کے جنوبی حصے میں مغربی اثر و رسوخ بھی گھٹانا ہے۔ اب تک یوکرین کے لیے یورپ کی سپلائیز میں روس کی طرف سے مداخلت کا گراف زیادہ بلند

باقی صفحہ نمبر ۲

یوکرین جنگ: کتنے روسی فوجی مارے جاچکے؟

کوئی بھی جنگ جب اپنے انتہائی مقام تک بڑھتی ہے تب ہلاکتوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جنگ ہلاکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ یوکرین جنگ میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ روس اور یوکرین کو غیر معمولی سطح پر جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ۲۴ فروری ۲۰۲۲ء کو جب روس نے یوکرین پر لشکر کشی کی تھی تب دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ جنگ زیادہ دن نہیں چلے گی، یوکرین جھیل نہیں پائے گا اور ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ اندازہ بھی لگایا جارہا تھا کہ روس کو زیادہ جانی نقصان کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور یہ کہ وہ خاصے کم جانی نقصان کے ساتھ اس جنگ میں فاتح کی حیثیت سے ابھرے گا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ تمام اندازوں کو مات دیتے ہوئے اس جنگ نے اب تک رُکنے کا نام نہیں لیا ہے۔

دو سال سے بھی زائد مدت سے جاری اس جنگ نے اب تک فریقین کو خاصے جانی نقصان سے دوچار کیا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریاں بڑھتی ہی گئی ہیں، جانی و مالی نقصان کا گراف بلند ہی ہوتا گیا ہے۔ دنیا بھر کے میڈیا آؤٹ لیٹس اور خفیہ اداروں نے اس جنگ میں ہونے والے جانی نقصان کے بارے میں اپنے اپنے اندازے دنیا کے سامنے رکھے ہیں۔ امریکا اور یورپ کے خفیہ اداروں کی دلچسپی زیادہ رہی ہے۔ یہ فطری امر ہے کیونکہ اس جنگ کی نوعیت اور نتائج کا ان دونوں خطوں پر اثر لازمی طور پر مرتب ہونا ہے۔

یوکرین جنگ میں ہلاک روسی فوجیوں کی درست تعداد معلوم کرنا ممکن ہے نہ آسان۔ روس کے دو بڑے میڈیا آؤٹ لیٹ (میڈیازونا اور میڈوزا) اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں کہ یوکرین جنگ میں ہلاک ہونے والے روسی فوجیوں کی تعداد معلوم کریں۔ اس کے لیے وہ ایک طرف تو سرکاری ریکارڈ کھنگالتے ہیں اور میڈیا میں رونما ہونے والی بعض خبروں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ترکے اور وراثت کے ریکارڈ کو کھنگالنے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تاحال کتنے فوجی ہلاک ہوئے ہیں۔

دی اکنامسٹ نے آخری بار جولائی ۲۰۲۳ء میں یوکرین جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد ۴۰ ہزار اور ۵۵ ہزار کے درمیان بتائی تھی۔ تب سے اب تک مزید ہلاکتیں واقع ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۲۴ فروری کو دی اکنامسٹ نے چارٹس کی مدد سے بتایا کہ روسی فوج کا جانی نقصان بڑھتا ہی جارہا ہے۔

دی اکنامسٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سرکاری اعداد و شمار سے قطعِ نظر غیر جانبدار ذرائع کی رپورٹس کے مطابق یوکرین جنگ اب تک جن روسی فوجیوں کی جان لے چکی ہے ان کی تعداد ۶۶ ہزار سے ۸۸ ہزار کے درمیان ہے۔ یہ اعداد و شمار ۳۱ دسمبر ۲۰۲۳ء تک کے ہیں۔ تب سے اب تک مزید ہلاکتیں واقع ہوئی ہیں۔ یہ اعداد و شمار مغرب کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذرائع سے ملنے والے فیڈ بیک کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں۔ برطانوی وزارتِ دفاع نے اندازہ لگایا ہے کہ اب تک ۷۰ ہزار روسی فوجی یوکرین جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ امریکی خفیہ اداروں اور سویلین انٹیلی جنس ایجنسیوں کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق یوکرین جنگ میں ہلاک ہونے والے روسی فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تک ہوسکتی ہے۔

گزشتہ موسمِ گرما میں یوکرین کی طرف سے غیر معمولی جوابی کارروائیوں کے نتیجے میں روسی ہلاکتوں میں اضافہ ہوا۔ موسمِ سرما میں بھی ہلاکتوں کا گراف بلند رہا ہے۔ باکھموت کے معرکے میں روسیوں کو زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان اعداد و شمار میں وہ فوجی شامل نہیں ہیں جو یا تو لاپتا ہوئے یا پھر شدید زخمی۔ امریکی محکمہ دفاع کی جو دستاویزات دی اکنامسٹ کو مل پائیں ان کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ یوکرین جنگ میں زخمی ہونے والے روسی فوجیوں کی تعداد ہلاک شدہ فوجیوں کی تعداد سے تقریباً چار گنا ہے۔

یوکرین کا جانی نقصان اس سے کہیں زیادہ ہے اور غیر جانبدار ذرائع بتاتے ہیں کہ روس کے برعکس یوکرین کے لیے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کا تناسب ایک اور آٹھ تک ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق اندازہ لگایا گیا ہے کہ یوکرین جنگ اب تک مجموعی طور پر ۲ لاکھ ۹۰ ہزار فوجیوں کی جان لے چکی ہے اور روس کے کم و بیش ۴ لاکھ ۶۰ ہزار فوجی غیر فعال ہوچکے ہیں۔ فروری ۲۰۲۲ء میں اِتنے ہی فوجیوں نے یوکرین پر ابتدائی حملوں میں حصہ لیا تھا۔

دی اکنامسٹ اور دیگر مغربی میڈیا آؤٹ لیٹس نے اپنے تجزیوں میں روسی ہلاکتوں میں ان فوجیوں کو بھی شامل کیا ہے جن کا تعلق پرائیویٹ آرمیز سے ہے۔ انہیں اصطلاحاً پرائیویٹ ملٹری کمپنیز کہا جاتا ہے۔ روس نے مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والوں کو بھی جنگ میں استعمال کیا ہے۔ جانی نقصان کے معاملے میں یہ نام نہاد فوجی بہت پیچھے ہیں۔ مجموعی ہلاکتوں میں ان کا تناسب ۱۹ر فیصد سے کم ہے۔

روسی فوجیوں کی ہلاکتوں کے تجزیے کی خاطر جو چارٹ بنائے گئے ہیں اُن کی درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔ ان میں بالعموم اُنہی فوجیوں کا ذکر ہوتا ہے جن کی باضابطہ شناخت ہوچکی ہے۔ ایسے فوجیوں کی تعداد نصف تک ہے۔ ہلاک ہونے والے روسی فوجیوں میں پرائیویٹ آرمیز سے تعلق رکھنے والے ۶ فیصد سے زیادہ نہیں۔ موازنے سے اندازہ ہوا ہے کہ ان میں سے ۲۵ فیصد ریگولر ملٹری یونٹس میں تھے۔ اِن ہلاکتوں میں ۳۵ سے ۳۹ سال تک کے فوجیوں کا تناسب زیادہ ہے۔ ۲۰۲۲ء میں یوکرین پر روس کی لشکر کشی کے بعد سے اب تک عمر کے اس گروپ میں ۱۵ تا ۱۷ ہزار ہلاکتیں ہوئی ہیں۔

روس کی آبادی میں مردوں کے تناسب سے ۲۵ سے ۲۹ سال کی عمر کے فوجیوں کی ہلاکتیں تناسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہیں۔ مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اندازوں کے مطابق جب سے جنگ شروع ہوئی ہے تب سے اب تک روسی آبادی میں ۲۰ سے ۵۰ سال تک کی عمر کے مَردوں میں سے ایک فیصد ہلاک ہوچکے ہیں۔

اپریل ۲۰۲۳ء تک روس کا یوکرین میں جانی نقصان ۱۹۴۵ء سے اب تک کے تمام مناقشوں میں اس کے مجموعی جانی نقصان سے زیادہ ہے۔ جنوری سے اب تک ہلاکتیں تیزی سے بڑھی ہیں۔ ایک روسی تھنک ٹینک کے مطابق روسی قیادت سوچتی ہے کہ یوکرین جنگ میں جانی نقصان کی یہ سطح ۲۰۲۵ء کے آخر تک برداشت کی جاسکتی ہے۔

روسی ادارے اس جنگ میں یوکرین کے جانی نقصان کے حوالے سے خاموش ہیں۔ اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ روس نے جتنے بڑے پیمانے پر گولا باری کی ہے، میزائل برسائے ہیں، اُس کے نتیجے میں یوکرین کا بھی خاصا جانی نقصان ہوا ہے۔ ۲۵ فروری ۲۰۲۴ء کو یوکرین کے صدر وولودومیر زیلینسکی نے بتایا کہ جنگ میں اب تک یوکرین کے ۳۱ ہزار فوجی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ امریکی خفیہ ادارے کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یوکرین کی فوج کا جانی نقصان اِس سے کم و بیش دُگنا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اس جنگ نے یوکرین میں ۱۰ر ہزار غیر فوجی باشندوں یعنی عام شہریوں کی جان لی ہے جبکہ غیر جانبدار ذرائع کہتے ہیں کہ یہ تعداد اِس سے دُگنی ہوسکتی ہے۔ یوکرین کے مختلف علاقوں میں روسی فوج نے جتنی گولا باری کی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یوکرین کو بہت بڑے پیمانے پر سویلین ہلاکتیں بھی جھیلنا پڑی ہیں۔ (ترجمہ: ابوصباحت)

"How many Russian soldiers have died in Ukraine?" ("Economist". February 24, 2024)

دائیں بازو کا عروج، یورپی سیاست پر اثرات

نینا ڈوس سانتوس

رواں ماہ رومانیہ کے دارالحکومت بخارسٹ میں ہونے والی کانفرنس میں یورپ کی قدامت پسند جماعتوں کے رہنما پہلی نظر میں فاتح نظر آئے۔ دو سال قبل ہونے والے اپنے آخری اجلاس کے بعد رجعت اور اعتدال کے ملے جلے نظریات رکھنے والا بازو مضبوط ہوا اور یورپی یونین کے بڑے حصے میں اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بلاک کے اہم اداروں میں اس کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

یورپی یونین کے قدامت پسند ارکان، یورپی پیپلز پارٹی کی شکل میں مل کر مہم چلا رہے ہیں اور یورپی پارلیمنٹ کے آئندہ انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کی راہ پر گامزن ہیں، جس کی صدارت اس وقت مالٹا کی رجعت اور اعتدال پسندی کے امتزاج پر مبنی بیانیے کی مالک رابرٹا میٹسولا کر رہی ہیں۔ دریں اثنا یورپی کمیشن کی سربراہی کے لیے ان کی امیدوار ارسلا وان ڈیر لیین کو دوسری مدت کے لیے منتخب کیے جانے کا امکان ہے۔ یہ صورتحال ایسے دور کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں رجعت اور اعتدال پسندی کے نظریے کی فطری طور پر توجہ معیشت اور سلامتی پر ہے۔ یہ نکات ووٹروں کے موجودہ خدشات میں سب سے آگے ہیں۔

اس کے باوجود نمایاں کارکردگی کے ساتھ ایک بڑی گتھی موجود ہے یعنی یورپ میں انتہائی دائیں بازو کی حمایت میں اضافے کے ماحول میں، سیاسی منظرنامے پر موجود مخالف سے کس طرح نمٹا جائے۔ اس ماہ عوامی سیاست کا نظریہ رکھنے والی پارٹی کے ابھرنے سے پرتگال کے رجعت اور اعتدال پسند بازو کو اکثریت حاصل کرنے سے روکنے میں مدد ملی، باوجود اس کے کہ اس نے موجودہ سوشلسٹ حکمرانوں کو شکست دی۔ نتیجے کا مطلب کمزور حکومت ہو سکتا ہے، جسے نئے قوانین منظور کروانے کے لیے عبوری مراعات دینا پڑیں۔

سویڈن میں، جہاں انتہائی دایاں بازو ۲۰۲۲ء سے حکمران اتحاد کا حصہ ہے، یہ رجحان پوری طرح جاری ہے، جس کا ثبوت امن وامان کے معاملے میں حالیہ کریک ڈاؤن اور امیگریشن پر سخت مؤقف ہے۔ سلوواکیہ اور ہنگری میں عوامیت پسند رہنما اتھارٹی کے مالک ہیں۔ وہ کئی سال تک باقاعدگی کے ساتھ اہم تازہ مسائل پر یورپی یونین کے اتحاد کو چیلنج کرتے رہے۔

برسلز میں قائم سیاسی حکمت عملی بنانے والی تنظیم 'کمپین لیب' کے بانی جیری زیگورٹس کا کہنا ہے کہ 'یورپ کا سیاسی مرکز یقینی طور پر دائیں بازو کی جانب جھک رہا ہے'۔

وہ کہتے ہیں کہ 'آپ اسے پہلے ہی (انتخابی) مہموں میں دیکھ رہے ہیں، جن میں موجودہ ماحول اعتدال پسندوں کو نقل مکانی اور دفاع پر زور میں اضافے، تحفظ، معاشی اور سوشل سکیورٹی جیسے موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کر رہا ہے'۔

مختصر یہ کہ انتہائی دائیں بازو کی بات پہلے ہی سنی جا رہی ہے اور جلد ہی وہ بڑی تعداد میں دکھائی دیں گے، خاص طور پر یورپی پارلیمنٹ میں۔ جو صورتحال جاری ہے، اس کے مطابق جون میں جب بلاک کے ۴۰ کروڑ شہری اپنا حق رائے دہی استعمال کریں گے تو یورپ کی چھوٹی جماعتیں ۲۵ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔

یورپی پارلیمنٹ کے ایسے ارکان ماحولیاتی تبدیلی سے نمٹنے اور یورپی یونین کی مشرق کی جانب توسیع کے ارادوں میں رکاوٹ بن سکتے ہیں تاکہ ایک دن یوکرین، مولدووا اور مغربی بلکانی ریاستوں کو یورپی یونین کا حصہ بنایا جا سکے۔

لیکن زاگورٹس کا کہنا ہے کہ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انتہائی دائیں بازو کے دھڑے اب بھی اتنے متحد ہیں کہ جوں کی توں صورتحال کو مسلسل چیلنج کرنے کے لیے اکٹھے ہو سکیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'یہ جماعتیں اہم معاملات پر ایک دوسرے کی سخت مخالفت کر سکتی ہیں جیسے کہ روس سے کیسے نمٹا جائے'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'کچھ یوکرین کے حامی ہیں جبکہ کچھ کھلے عام کریملن کی حمایت کرتے ہیں'۔

یورپ میں انتہائی دائیں بازو کا عروج کوئی تعجب کی بات نہیں۔ درحقیقت ایسا کچھ عرصے سے جاری ہے۔ بخارسٹ میں رجعت مائل اعتدال پسند عہدے دار نے فرانس کے صدر ایمانوئل میکروں پر الزام عائد کیا کہ وہ اس مسئلے کا سبب بنے، جب انہوں نے ۲۰۱۶ء میں اپنی تحریک 'ان مارچ' کی بنیاد رکھی۔ عہدیدار نے کہا: 'انہوں (میکروں) نے ہر کسی کے لیے اعتدال کے میدان کو تباہ کیا اور ہمیں مسئلے سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دیا'۔

دوسروں کا اعتدال ہے کہ عوامی سیاست کی کشش ہمیشہ رہے گی اور وہ ان مسائل کا آسان حل پیش کرتی ہے، جن سے روایتی جماعتیں نمٹنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ مصارفِ زندگی کے بحران اور کووڈ-۱۹ سے پیدا ہونے والے حالات نے اس تبدیلی کو تیز کر دیا ہے۔ متوسط طبقے کے رائے دہندگان کو سماجی و اقتصادی سیڑھی سے نیچے اور غیر نمایاں عناصر کے ہاتھوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ یورپ کے کسان، جن کے ذریعہ معاش کو ماضی میں یورپی یونین کی مشترکہ زرعی پالیسی کے تحت تحفظ فراہم کیا گیا، اب بنیاد پرستوں کو گلے لگا رہے ہیں۔

تاہم جیسے یورپ کی رجعت مائل معتدل جماعتیں اس خطرے کو بے اثر کرنے کے لیے انتہائی دائیں بازو کی پالیسیوں کو اپنانے کی کوشش کر سکتی ہیں، اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انتہائی دائیں بازو کی جماعتیں تسلیم کرتی ہیں کہ ان کے کچھ زیادہ جارحانہ اقدامات ووٹروں کو دور کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ جماعتیں اعتدال کی جانب مزید جھکتی جا رہی ہیں۔

فرانس کی سیاسی جماعت نیشنل ریلی کی رہنما میرین لی پین نے نام نہاد فریگزٹ کے اپنے منصوبوں کو ترک کر دیا ہے اور حال ہی میں روس کے یوکرین پر حملے کی مذمت کی ہے، حالاں کہ وہ کبھی روسی صدر ولادی میر پوتن کی کھلی مداح تھیں۔

دریں اثنا جرمنی کی دائیں بازو کی سیاسی جماعت اے ایف ڈی کی قیادت نے فوری طور پر ایک خفیہ اجلاس کی خبروں سے خود کو دور کر لیا جس میں کچھ ارکان نے 'معاشرے کا حصہ بننے میں ناکام رہنے' افراد کو ملک بدر کرنے پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

یہاں تک کہ گیرٹ ولڈرز، جنہوں نے حال ہی میں نیدرلینڈز میں ہونے والے انتخابات میں کامیابی حاصل کی لیکن حکومت بنانے سے قاصر ہیں، بظاہر انہیں احساس ہے کہ انتہائی دائیں بازو کے لوگ عملی طور پر کسی ملک کو چلانے کی بجائے اسٹیبلشمنٹ سے باہر رہ کر دباؤ ڈالنے میں بھی اتنے ہی بااثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود، یورپ میں دائیں بازو کی تحریکوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ اہم ہے کیونکہ یہ دنیا کے جمہوری ممالک کے سب سے بڑے گروپوں میں سے ایک میں کام کرنے کے طریقے کو تبدیل کر رہا ہے۔ یہ اس وقت ہو رہا ہے جب دنیا کے دیگر حصوں میں آمریت پنپ رہی ہے۔

اس تبدیلی کے اثرات دیرپا ثابت ہو سکتے ہیں لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۹/مارچ ۲۰۲۴ء)

یہ ساری خرابیاں کس کھاتے میں؟

ابوالحسن اجمیری

دنیا جیسے تیسے چل ہی رہی تھی۔ معاملات بگڑے ہوئے تو تھے مگر ایسے بھی بگڑے ہوئے نہیں تھے کہ سمجھ ہی میں نہ آتے اور سلجھائے ہی نہ جاسکتے۔ اچانک ایسا بہت کچھ ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بڑی طاقتوں نے مل کر کورونا کی وبا کے نام پر کچھ عجیب ہی کھیل کھیلا۔

عوارض تو یقیناً تھے مگر اُن کی نوعیت اور شدت ایسی نہ تھی کہ اِتنی تیزی سے اور اِتنے بڑے پیمانے پر ہلچل مچتی۔ ہلچل مچائی گئی۔ کورونا کی وبا کے نام پر ایک دنیا کو خلجان و خلفشار میں مبتلا کیا گیا۔ اِس سے پہلے کہ لوگ کچھ سمجھ پاتے، اُنہیں معاشی سرگرمیوں کی بندش پر مجبور کرکے گھروں تک محصور کردیا گیا۔ کورونا وائرس کے ہاتھوں ہلاکت کا بازار اِس طور گرم کیا گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں لاک ڈاؤن ''ٹرینڈنگ'' کرنے لگا۔ ایک دنیا تھی کہ تھی اور نہیں تھی۔ کسی نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ یوں پورے کے پورے ملک بند ہوجائیں گے، معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

ترقی یافتہ دنیا میں زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ بیشتر اموات بیماری سے زیادہ خوف کا نتیجہ تھیں۔ انتہائی پُرتعیّش اور آرام دہ زندگی بسر کرنے والوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی وبا آئے گی اور زندگی کے دھارے کا رخ ہی پلٹ دے گی۔ معیشتیں تلپٹ ہوکر رہ گئیں۔ دنیا بھر میں کروڑوں افراد بے روزگار ہوئے۔ ہر معاشرے میں سب سے نچلا طبقہ پس کر رہ گیا۔

خدا خدا کرکے کورونا کی وبا رخصت ہوئی اور زندگی بحال ہوئی۔ کورونا کی وبا کو رخصت ہوئے ایک مدت ہوچکی ہے مگر اُس کے شدید منفی اثرات کا سامنا دنیا کو اب تک ہے۔ کورونا کی وبا کے بارے میں قیاس کے گھوڑے دوڑائے گئے۔ سازش کے نظریے پر یقین رکھنے والوں نے اِسے Great Reset کا نام بھی دیا یعنی یہ کہ دنیا کو روک کر سب کچھ نئے سِرے سے ترتیب دیا گیا تاکہ معاملات قابو میں رہیں۔ کسی کی نظر میں کورونا کی وبا دراصل نئے عالمی نظام کو چُپ چاپ مسلط کرنے کی مشق تھی اور یہ مشق بہت حد تک کامیاب رہی۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ ایک ایسی بیماری سے لرزتے کانپتے پائے گئے جو بہت حد تک تھی ہی نہیں۔ میڈیا کے ذریعے شدید خوف کا ماحول پیدا کیا گیا۔ جن عوارض کی بنیاد پر کورونا کی وبا سامنے آئی (یا لائی گئی) وہ تو اب بھی ہیں۔

خیر، جانکار کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ بڑی طاقتیں اپنے ہاتھوں سے بہت کچھ نکلتا ہوا دیکھ کر بوکھلا گئی تھیں اور چاہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح معاملات کو اپنے تصرّف میں رکھا جائے۔ انہوں نے کئی عشروں کے دوران رونما ہونے والی بہت سی جوہری تبدیلیاں دیکھیں اور جب یہ محسوس کیا کہ اب عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ نہ کیا گیا تو معاملات ہاتھ سے نکل جائیں گے تب پوری دنیا کو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ایک بڑا دھچکا پہنچایا گیا۔

تین چار عشروں سے چین نے چَین حرام کر رکھا ہے۔ مغربی طاقتیں کم و بیش چار صدیوں سے کُھل کر کھیلتی آئی ہیں۔ پہلے یورپ نے مزے لُوٹے اور پھر امریکا بھی اُن کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ یورپ کی کئی طاقتوں نے متعدد خطوں کو آپس میں تقسیم کیا اور اپنے لیے فقید المثال نوعیت کی ترقی و خوشحالی کی راہ ہموار کی۔

بیسویں صدی کا بیشتر حصہ مغربی طاقتوں کی مٹھی میں رہا۔ گزری ہوئی صدی کے اواخر میں جب ٹیکنالوجی نے حیران کُن رفتار سے پیش رفت کا عمل شروع کیا تو ٹیکنالوجی دنیا بھر کے خطوں تک پہنچنے لگیں۔ مغرب کو منہ دینے والوں میں جاپان سب سے آگے رہا۔ اُس کے بعد جنوبی کوریا اور چین نے بھی مسابقت کے میدان میں قدم رکھا۔ چین کی پیش رفت زیادہ حیران کن رہی ہے کیونکہ اِتنی بڑی آبادی کو قابو میں رکھتے ہوئے عالمی برادری میں اپنے آپ کو منوانا بچوں کا کھیل نہ تھا۔

بہت بڑی آبادی کے ہوتے ہوئے ترقی تو بھارت نے بھی کی ہے مگر اُس کے ہاں ترقی کے ثمرات ایک خاص طبقے تک محدود ہیں۔ چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک شدید پسماندگی کا شکار ہے۔ معاشی ہی نہیں، معاشرتی گراوٹ بھی شرمناک ہے۔ بھارت میں آج بھی کم و بیش ۹۰ کروڑ افراد کسمپُرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کے لیے بنیادی سہولتوں کا سیٹ اپ بھی معقول نہیں۔ چار پانچ بڑے اور تیس چالیس چھوٹے یا درمیانی حجم کے شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک آج بھی شرمناک افلاس کے شکنجے میں ہیں۔ بھارت میں جو لوگ معقول انداز سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکے ہیں، اُن کی تعداد پانچ سے سات کروڑ قرار دی جاسکتی ہے۔ باقی ملک تو معاشی و معاشرتی پستی کی دلدل ہی میں دھنسا ہوا ہے۔

چین کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ چینی قیادت نے پورے ملک کے لیے کم از کم بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا معاملہ تو طے کردیا ہے۔ عام آدمی کو بنیادی سہولتوں کے لیے پریشانی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ پوری قوم میں مثبت سوچ نمایاں ہے۔ ملک سے محبت کا عنصر طاقتور ہے۔ مجموعی قومی ترقی کی سوچ دن بہ دن پروان چڑھتی جارہی ہے۔ بیرونِ ملک کام کرنے والے چینی بھی قومی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

مغربی طاقتوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اُنہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ کل کو کسی بھی خطے میں کوئی ملک ابھر کر اُن کے مقابل آسکتا ہے۔ یہ سوچ بے بنیاد نہیں تھی۔ امریکا اور یورپ نے ایک طرف تو اپنی بھرپور ترقی کی راہ ہموار کر رکھی تھی اور دوسری طرف انہوں نے باقی دنیا کو شدید پسماندگی، خلفشار اور بے یقینی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ باقی دنیا کے لیے اُن کے مقابل آنا ممکن ہی دکھائی نہ دیتا تھا۔

چین، جنوبی کوریا، روس اور چند دوسرے ممالک نے تیزی سے ابھر کر مغرب کو للکارا ہے۔ جاپان اور بھارت سے مغرب کو کچھ خاص خطرہ محسوس نہیں ہوتا کیونکہ دونوں ہی فرماں بردار و تابع دار ہیں۔ چین اور روس سے زیادہ خطرہ لاحق ہے کیونکہ وہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ چین اب اِس قدر پنپ چکا ہے کہ مغرب کے لیے اُس پر قابو پانا انتہائی دشوار ہوچکا ہے۔ اُسے عسکری مناقشوں میں الجھانے کی کوششیں بھی اب تک بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ ایسے میں مغربی قوتوں کے پاس مختلف خطوں میں خلفشار پیدا کرنے یا برقرار رکھنے کے سوا چارہ نہیں۔ اور یہی کیا بھی جارہا ہے۔

مغربی طاقتیں عالمی معیشت کے لیے اپنی مرضی کی الجھنیں پیدا کرنے اور مختلف خطوں کو کنٹرول کرنے کے لیے مشرقِ وسطیٰ کو اچھے ہتھکنڈے کے طور پر بروئے کار لانے کی روش ترک کرنے کو تیار نہیں۔ جب بھی معاملات ہاتھ سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں تو اسرائیل اور فلسطینیوں کو باہم متصادم کرکے پوری دنیا کے لیے بحرانی کیفیت پیدا کردی جاتی ہے۔ ایک چھوٹا سا خطہ پوری دنیا کے لیے دردِ سر بنادیا گیا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۴

غزہ میں رمضان...

Eman Alhaj Ali

اسرائیلی بربریت نے ہماری رمضان کی مسرتوں کو برباد کردیا ہے۔ اب صرف رمضان کی خوبصورت یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ رمضان کے بابرکت مہینے کا آغاز ہوگیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان روزہ رکھ رہے ہیں، اپنے خاندان کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں اور عبادات میں مصروف ہیں۔ لیکن ہم اہلِ غزہ کے لیے یہ مہینہ مصائب، مشکلات اور غموں سے معمور ہے۔

گزشتہ پانچ مہینوں سے اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ہم بربریت، بیماری اور بھوک و پیاس کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ مشکلات رمضان کے مہینے میں بھی نہیں رُکیں، نہ اس میں کمی آئی ہے۔ ہم میں سے بیشتر افراد غذا اور عبادت کے لیے محفوظ مقامات کی تلاش میں ہیں۔ گزشتہ سال کی یادیں ہمارا اثاثہ ہیں۔ اسرائیلی ڈرونز اور دھماکوں کے شور میں اپنی آنکھیں بند کرکے میں گزشتہ سال غزہ میں گزارے شاندار لمحات کو یاد کرتی ہوں۔

رمضان کی تیاری کئی ہفتوں قبل شروع ہوجاتی تھی۔ لوگ رمضان سے متعلق خریداری کے لیے بازاروں کا رخ کرتے۔ رمضان کی خریداری کے لیے ایک مشہور جگہ قدیم شہر کا روایتی بازار الزاویہ تھا، یہاں رمضان کی تمام غذائی اشیاء دستیاب ہوتی، بہترین کھجور، کھٹے اچار، ذائقہ دار زیتون، خوشبودار مسالے، خشک خوبانی کے پیسٹ، خشک میوہ جات اور طرح طرح کے پھلوں کے جوس۔ نئے کپڑے بھی خریدے جاتے، عبادات کے لیے عبایا، لڑکیوں اور لڑکوں کے خوبصورت ملبوسات بھی بہت زیادہ پسند کیے جاتے۔ بچے والدین کا ہاتھ پکڑے، انہیں رمضان کے رنگارنگ لالٹین خریدنے کا کہتے۔ سڑکوں پر لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ راستوں کو سجایا جاتا ہے اور رمضان کے خوبصورت نشید بھی چلائے جاتے ہیں۔ گویا کہ ایسا ماحول ہوتا ہے جس کا دوسرے دنوں میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

رمضان کے پہلے روز غزہ اور اس کے اطراف میں تراویح کی صدا گونج اٹھتی ہے۔ بچے رات گئے تک سڑکوں میں کھیلتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ افراد ایک دوسرے کے ساتھ سحری کرتے اور فجر کی نماز ایک ساتھ ادا کرتے۔ سہ پہر سے پہلے سب اپنے گھروں میں واپس آجاتے اور قرآن کی تلاوت کرتے۔ بچے گھر یا مسجد میں قرآن کی تلاوت اور حفظ کرتے۔ والدین بچوں کو انبیاء کے واقعات سناتے۔ اسی اثنا میں افطار کی تیاریوں کا وقت آجاتا ہے۔ سورج کے غروب ہونے سے کچھ دیر قبل غزہ کی گلیاں کھانوں کی مسحور کن خوشبو سے معطر ہوجاتی۔ لوگ مختلف اقسام کے کھانے اپنے گھروں میں تیار کرتے۔

پڑوس سے افطاری کی اشیاء بھجوائی جاتیں جو انہوں نے تازہ تیار کی ہوتی ہیں۔ اس طرح لانے والے کو بھی کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جاتا۔ سورج کے غروب ہونے سے پہلے افطاری کا سامان ترتیب سے رکھ دیا جاتا اور تمام افراد اس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے ہی مسجد سے اذان کی آواز آتی ہے، لوگ مزیدار کھانے کی اشیاء ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہنستے مسکراتے ہوئے کھاتے۔ افطار کے بعد مرد، خواتین اور بچے تراویح کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کی آواز پورے غزہ میں گونجتی ہے۔ اب بچوں کے لیے خوشی کا ایک اور موقع آجاتا ہے کیونکہ اب ان کی پسندیدہ میٹھی ڈش قطایف تیار کی جاتی ہے۔ جیسے ہی قطایف سے لطف اندوز ہوکر سب فارغ ہوتے ہیں، رمضان کی خصوصی نشریات دیکھنے کے لیے جمع ہوجاتے ہیں۔

غزہ کے لوگوں کے لیے رمضان سال کا بہترین مہینہ ہوتا ہے۔ رمضان میں غزہ گویا دنیا کا خوبصورت ترین جگہ معلوم ہوتا۔ لیکن اس سال ہم اپنی عبادات کو امن و سلامتی کے ساتھ ادا نہیں کرسکتے۔ رمضان کی ساری رنگارنگی اسرائیلی بمباری اور خوفناک آوازوں سے ماند پڑگئی ہے۔ بچوں کے سڑک پر کھیلنے کی خوبصورت آواز ملبے تلے دبے افراد کے کراہنے اور ان کی چیخوں سے تبدیل ہوگئی ہے۔ زندگی سے بھرپور آبادی قبرستان بن گئی ہے۔ مسجدیں ویران ہیں کیونکہ تباہ کردی گئی ہیں۔ سڑکیں اور گلیاں ملبے میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ لوگوں کے پاس روزہ کھولنے اور سحری کے لیے غذا اور پانی موجود نہیں۔ لوگ اب مبارکباد کے لیے نہیں بلکہ تعزیت اور غم کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ جب سے رمضان کا آغاز ہوا ہے ہم ایک کے بعد دوسرے شہید کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ غم اس قدر شدید ہے جس کا اندازہ ممکن نہیں، دنیا نے فلسطینی افراد کو رمضان کے بابرکت مہینے میں اسرائیل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کی نسل کشی کرے۔ (ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Remembering the beauty of Ramadan in Gaza". ("Aljazeera". March 11, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

اُمت مسلمہ

منصب، تقاضے اور مستقبل

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

قیمت: ۱۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

بقیہ: مودی جنوبی بھارت کو جیت پائیں گے؟

ہونے والی کامیابی بی جے پی کے لیے فتح کہلائے گی۔ بی جے پی تامل ناڈو میں ۷ نشستیں جیتنا چاہتی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں تامل ناڈو اُس کے ووٹوں کا شیئر ۴ فیصد تھا، جسے وہ اب ۲۰ فیصد تک لے جانا چاہتی ہے۔ تامل ناڈو میں دراوڑا مُنیترا کازاگم (ڈی ایم کے) پارٹی کی حکومت ہے جسے بی جے پی ۲۰۲۶ء میں ختم کرنا چاہتی ہے۔

بی جے پی کا بیانیہ اقلیتوں کے خلاف ہے۔ اس حوالے سے اُسے اب بھی تنقید کا سامنا ہے اور اُس کی طرف آنے والے ووٹرز تشکیک کا شکار ہیں۔ کیرالا میں پارٹی کے عہدیدار مسلمانوں پر لَو جہاد کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم لڑکے ہندو اور مسیحی لڑکیوں کو ورغلا کر مسلم بنا لیتے ہیں۔ انا ملائی پر ایک مقدمہ زیرِ سماعت ہے جس کے مطابق انہوں نے ۲۰۲۲ء میں ایک تقریر کے دوران مسیحی مشنریوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ دیوالی میں پٹاخوں پر پابندی لگوانا چاہتے ہیں۔

انا ملائی نے گزشتہ برس وزیرِ اعلیٰ کے بیٹے پر الزام لگایا تھا کہ وہ مسیحی مشنریوں کے زیرِ اثر شمالی بھارت میں پائی جانے والی ہندو ازم کی شکل کو ذہنی مرض قرار دیتا ہے۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Inside Narendra Modi's battle to win over the south". ("The Economist". February 29, 2024)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950